

۱۷۵۰ - ان سفر

(مختب افسانے)

غلام حبیبانی

طبع : اول  
تعداد : پانچ سو  
طباعت : اوم سائی گرافکس نارائن گورہ  
3-4-528 سید آباد (29)  
تاریخ اشاعت : دسمبر ۱۹۹۳ء  
کتابت : سید عبدالحمید  
سرورق : سعادت علی خان  
ناشر : مصنف  
قیمت : ( ۵۰ ) روپے

A.C.C. No.

472

اعانت : اُردو اکیڈمی آنڈھرا پردیش - حیدرآباد۔  
اہتمام : ادارہ شعر و حکمت - حیدرآباد۔  
ملنے کے پتے :-

- (۱) سیل کاؤنٹر۔ روزنامہ سیاست، جواہر لال نہرو روڈ، حیدرآباد۔
- (۲) "سب رس"، کتاب گھر، ایوانِ اردو - پنجہ گٹہ روڈ - حیدرآباد (۴۸۲)
- (۳) کتب خانہ انجمن ترقی اردو، آنڈھرا پردیش - اردو محال، حمایت نگر حیدرآباد۔
- (۴) اُردو اکیڈمی آنڈھرا پردیش، اے سی گارڈس، حیدرآباد۔
- (۵) بزمِ ربانی، 195/3 RT دجنے نگر کالونی - حیدرآباد۔ (۴۵۷)

- ۱۔ قافلہ درد ۱۳
- ۲۔ اکھڑے ہوئے لوگ ۲۲
- ۳۔ آٹھواں سفر ۳۵
- ۴۔ ریزہ ریزہ مہک ۴۰
- ۵۔ خوابوں کے پُل ۴۵
- ۶۔ دل زار ۵۲
- ۷۔ تہہ مدتہ ۵۸

- ۸۔ اینی ۶۷
- ۹۔ نجات کا لمحہ ۸۷
- ۱۰۔ نیم کا پیٹر ۹۴
- ۱۱۔ صبح کا بھولا ۱۰۶
- ۱۲۔ پیرگام کا ڈاک بنگلہ ۱۱۳
- ۱۳۔ ڈاکٹر احسان ۱۲۱
- ۱۴۔ شام سے پہلے ۱۳۲

میں نے زندگی میں جو بھی پایا ہے، اپنی والدہ اور  
والدہ قلام ربانی صاحب (مرحوم) کی تربیت اور  
شفقت کا فیض ہے۔

وہ ساری عمر دوست کی طرح میرے ساتھ رہے۔  
آج بھی پیپے اور تادم انہی رہی ہیں۔



افسانے لکھنا زمانہ طالب علمی سے شروع کیا۔ کوئی پندرہ بیس برس ہندو پاک کے تقریباً تمام موقر ادبی رسالوں میں میری کہانیاں شائع ہوتی رہیں پھر ایک عرصے تک میرے لکھنے کی رفتار بہت کم رہی۔ اس کی بڑی وجہ یونیورسٹی کی مصروفیات تھیں۔ اب ادھر پچھلے آٹھ دس برس سے یہ سلسلہ پھر شروع کر رکھا ہے۔ اور کوشش ہے کہ رفتار تیز رہے۔

اپنے ڈراموں کی طرح افسانوں کے پہلے مجموعے کو بھی شائع کرنے کا خیال اب آیا ہے۔ یہ افسانے بے سرو سامانی کی حالت میں بکھرے پڑے تھے انہیں کتابی شکل میں مزین دیکھا کرنے میں شاید یہ خیال بھی کارفرما رہا ہے کہ اس طرح ان سے برقی ہوتی اپنی پچھلی بے اعتنائی کے احساس ندامت سے چھٹکارا پا جاؤں اور اگر ان کو پڑھنے کے بعد آپ نے پسند کیا تو مجھوں گا تاخیر کی تلافی ہو گئی۔

سرورق کے ڈیزائن کے لیے جناب سعادت علی خان کا، اور کتابت کے لئے جناب سید عبدالحمید کامنوں ہوں، جن کا تعاون مجھے ہمیشہ حاصل رہا۔

غلام جیلانی

## اُردو افسانے کا ایک معتبر نام

غلام حیلانی اردو افسانے کا ایک بھولا ہوا نام تھا۔ آج سے کوئی تیس پینتیس برس پہلے تک ہندوستان اور پاکستان کے میکاری ادبی رسالوں میں اس قلم کار کی تحریریں بڑے اہتمام سے شائع ہوا کرتی تھیں۔ وہ باذوق قارئین کا پسندیدہ افسانہ نگار اور ڈراما نویس تھا۔ پھر غلام حیلانی نے ادب سے ایک طرح کی کنار کشی اختیار کر لی۔ قارئین کی ذہنیں بھی باقی نہ رہی جو اس کی تخلیقات کو ذوق و شوق سے پڑھا کرتی تھی۔ گذشتہ چند برسوں سے یہ نام پھر رسالوں میں نمایاں طور پر شائع ہونے لگا۔ قارئین کو یوں لگا جیسے وہ بساط ادب کا کوئی نووارد ہے جس کے فن میں بڑی صلاحیت اور پختگی ہے۔ جس کی تحریر بڑی میٹھی ہوئی ہے۔

غلام حیلانی نے ماضی میں بے شمار کہانیاں لکھی ہیں۔ لیکن اپنی کہانیوں کا کوئی مجموعہ شائع نہیں کرایا۔ ایسا ہوتا تو آج ادب کی دنیا میں کسی تعارف کے محتاج نہ ہوتے سال بھر پہلے ان کے ڈراموں کا مجموعہ ”دوسرا کنارہ“ شائع ہوتا تو ایک اچھے اور بڑے ڈراما نگار کی حیثیت سے جلد ہی انہوں نے اپنی شناخت بنالی۔ اب وہ اپنی منتخب کہانیوں کا یہ مجموعہ پیش کر رہے ہیں۔ اس مجموعے میں گذشتہ دور کی انہوں نے چند ہی کہانیاں شامل کی ہیں۔ ایسی کہانیاں جو آج کی تحریروں سے کسی قدر میل کھاتی ہیں۔ ایسا نہیں کہ ان کے پچھلے دور کی کہانیاں ناقابل اعتنا ہیں۔ ان میں کئی کہانیاں قدر اول کی

تخلیقات ہیں۔ لیکن ان کا مزاج اور اسلوب مختلف ہے۔ ان کہانیوں کا ایک علاحدہ مجموعہ شائع کیا جانا چاہیے۔ اُس دور کی چند نمائندہ کہانیوں جیسے ”اینی“ ”شام سے پہلے“ اور ”نیم کا پیٹر“ کو اس مجموعے میں شامل کیا گیا ہے : یہ سدا بہار کہانیاں ہیں۔ ان میں زندگی کے ایسے تجربات کو موضوع بنایا گیا ہے جن کا تعلق ان کے نفیاتی اور سماجی رویوں سے ہے۔

اُن دنوں پاکستان کا ”نقش“ ہر سال ہندوپاک کے بہترین افسانوں کا انتخاب شائع کیا کرتا تھا۔ افسانے ”نیم کا پیٹر“ اور ”اینی“ اپنے اپنے سال طباعت کے انتخاب میں شامل رہے ہیں۔ ”اینی“ میں ”میدیم“ ایک بوڑھی اینگلو انڈین خاتون ہے جس کی ساری عمر دکھ جھیلنے اور غم سہتے گزری ہے۔ فن کار نے اس کی تصویر الفاظ میں یوں کھینچی ہے۔

”میدیم جھوٹے سے قد کی کمزور جسم والی عورت تھی۔ سر کے بال سفید ہو چکے تھے۔ فراک پہنتی تھی۔ جس میں سے سوکھے ہاتھ پیروں نکلے رہتے، جیسے کسی ٹھنڈے پر بچی ہوئی دد ایک سنگی شاخیں۔ گالوں کی ہڈیوں پر نیکی کے فریم کی عینک طبعی رہتی جس کے اندر سے دو منجمد آنکھیں بھٹکتے ہوئے ہزاروں کی مانند ٹم ٹماتی رہتیں۔ اس کی بے رنگ آنکھوں کو غور سے دیکھنے پر محسوس ہوتا جیسے ان میں صدیوں کے غم اور دکھوں کی داستانیں جذب ہوں۔ بے پناہ غم کا یہی احساس اس کے چہرے پر جھریوں کے گہرے جال کو دیکھنے سے بھی ہوتا تھا۔ جیسے ان آنکھوں نے تمام عمر دکھوں کو دھارے بہا بہا کر چہرے کو سیراب کیا ہو۔ اور اب جب کہ یہ دھارے سوکھ گئے تو یہ سر زمین بھی خشک ہو کر ترخ گئی اور بے شمار لکیروں کا جال چہرے پر چھوڑ گئی۔“

زیر نظر مجموعے کی بیش تر کہانیاں عصری احساسات و تجربات سے منسوب ہیں۔ ایک خاص شاہدہ اور تجربہ، ہجرت، بے وطنی اور بے زمینگی کا ہے۔ یہ آج کے دور کا عالم گیر فنانسینا ہے۔ نوآزاد ایشیائی ممالک کے باشندے اس کا خاص طور پر شکار ہوئے ہیں۔ کہیں سیاسی اسباب سے اور کہیں معاشی وجوہ سے لوگ ترک وطن کرنے پر مجبور ہوئے ہیں۔ ان میں

کثیر تعداد نو جوانوں کی ہے۔ اس کے نتیجے میں خاندانوں کے بٹوارے ہو گئے۔ رشتے ٹوٹ گئے۔ اور قدردان کا عظیم بحران پیدا ہو گیا۔ اپنے وطن میں رہ کر بے وطنی اور بے زمینگی کا احساس بھی آج کی تیز رفتار زندگی کا المیہ ہے۔

غلام جیلانی نے اس عالمی صورت حال کے تمام سماجی، معاشی، اور نفسیاتی پہلوؤں کو اپنی کہانیوں میں بڑی فن کاری کے ساتھ سمیٹا ہے۔ قافلہ درد، تہہ در تہہ، ریزہ ریزہ مہک، اور، آٹھواں سفر، اس کی عمدہ مثالیں ہیں، ان کہانیوں میں ان کا رد عمل نہ تو فلسفیانہ ہے اور نہ سماجی مصلح کا ہے۔ ان میں ایک درد مندی ہے۔ وہی درد مندی جو ہم کو میر کی شاعری میں محسوس ہوتی ہے۔

غلام جیلانی کی کہانیوں کے موضوعات متذکرہ بالا مسائل تک محدود نہیں ہیں۔ انہوں نے انسان کی داخلی کشمکش، نفسیاتی اور دجری مسائل پر بھی عمدہ کہانیاں لکھی ہیں، جیسے ڈاکٹر احسان، بیس رنگام کا ڈاک بنگلہ، نجات کا لمحہ، دلِ ناز وغیرہ۔

حقیقت یہ ہے کہ فنی تخلیق کسی موضوع کی اسیر نہیں ہوتی۔ فن میں موضوع محض بہانہ بن جاتا ہے۔ غلام جیلانی کی کہانی پڑھتے ہوئے ہم ایک ایسی دنیا میں پہنچ جاتے ہیں جس میں خارجی مشاہدات داخلی جذبات سے ہم آمیز ہو جاتے ہیں۔ غلام جیلانی ایک مشاق فن کار ہیں۔ وہ کہانی سلیقے سے بنتے ہیں۔ غیر ضروری تہید کے بغیر وہ قاری کو کسی وقوع یا واردات کے دو بدلے آتے ہیں۔ قاری میں ایک تجسس پیدا ہوتا ہے۔ اور رشتہ رشتہ وہ خود بھی کہانی کار کا ذہنی رشتہ یا ایک شخص قصہ بن جاتا ہے۔

وہ صفِ اول کے ڈراما نویس بھی ہیں۔ اور اس کا ثبوت ان مکالموں کی برجستگی اور دل نشینی ہے جو ان کی کہانیوں میں ملتے ہیں۔

غلام جیلانی کی کہانیوں کی ایک نمایاں خصوصیت کا ذکر کئے بغیر میری یہ مختصر سی بات ادھوری رہ جائے گی۔ اور وہ ہے ان کی زبان، جو سادگی، سلاست اور روزمرہ کے خوبصورت اقتضائے مزین ہے۔ کردار اور واقعات کے لحاظ سے مقامی مردوبہ الفاظ کا استعمال کہانی کا

بھر پور تاثر برقرار رکھتا ہے۔ اس کی عمدہ مثالیں ان کی کہانیاں ”نیم کا پیٹر“، ”تاملہ درد“، ”نجات کا لمحہ“، ”ریرہ ریزہ ہبک“ اور ”آٹھواں غر“ ہیں۔

”نیم کا پیٹر“ دلی کے پاس برج کے علاقے میں ایک گاؤں کی کہانی ہے۔ غلام جیلانی نے اس کہانی میں اپنے مخصوص اسلوب کے ساتھ زبان محاوروں اور تشبیہوں تک میں مقامی رنگ اور الفاظ کا ایسا خوب استعمال کیا ہے کہ تاثر کا ایک مسلسل فضا شردع سے آخر تک قائم رہتی ہے۔

\_\_\_\_\_ ”بنسی کو جب یقین ہو گیا کہ اب دیر تک نیند نہ آسکے گی تو اٹھ کر بیٹھ گیا۔

جو کیدار کی لاش کی ٹھکی کی ٹھک اور کتوں کی چیخ پکار رات کی پراسرار تاریکیوں میں جذب ہو چکی تھی۔“ ہر طرف گہرا سناٹا چھایا ہوا تھا۔ صرف کبھی کبھی نیم کے پسے سے چوپایوں کے جگالی کرنے کی آوازیں سنائی دے جاتیں، جیسے کوئی سروتے سے چھال رہا ہو۔

آہستہ آہستہ قدم دھرتا بنسی مولیشیوں کے پاس چلا آیا۔ اس کے قدموں کی آہٹ پا کر وہ ایک لمحہ کے لئے ٹھٹھک جاتے۔ گردن موڑ کر اس کی طرف دیکھنے لگتے اور پھر جگالی میں مصروف ہو جاتے۔ ان کے آگے دھری ناندیں اور پرانتیں چارے سے خالی ہو چکی تھیں۔ پھر بھی گوبر اور مینگنیوں کی مخصوص بو کے ساتھ دھڑے میں ابھی تک کھلی اور بھوسے کی بو پھیلی ہوئی تھی۔ چھپرتے بنسی کے جھپٹے بیلوں کی جوڑی بندھی تھی۔ جانے پہچانے قدموں کی چاپ سن کر وہ دونوں بدن بھٹک کر اٹھ کھڑے ہوئے اور خالی الادندی میں منہ سے ”فوں، فوں“ کر کے بھوسہ اڑانے لگے۔

\_\_\_\_\_ بنسی نے انھیں پیار سے تھپ تھپایا۔

”ریرہ ریزہ ہبک“ داستانوی انداز میں آج کے ہندی بحران پر لکھی ایک خوبصورت کہانی ہے جس کی زبان میں داستانوی طرزِ ادا الفاظ اور محاوروں کا استعمال بڑی سہانگی کیفیت طاری رکھتا ہے۔

الفاظ کے محتاط استعمال کے ساتھ اثر آفرین رواں تحریر فن کاری کی ایک مشکل منزل ہے۔

غلام جیلانی نے اس منزل کو پایا ہے۔

مغنی تبسم  
۲۱ اپریل ۱۹۹۳ء

اب گھر بھی نہیں گھر لگی تنہا بھی نہیں ہے  
سوچا تھا کسی روز کہ گھر جاؤں گے اک دن

(ساتی فاروقی)

## قافلہ درو

— دلی سے بدرپور آنے تک ساری بس بھر گئی تھی۔

مجھے پتہ بھی نہ چلا۔ میں ارد گرد سے بے خبر، آنکھیں بند کئے، پٹمان کی پھنگ پر معلق لٹکا ہوا، نیچے دیکھ رہا تھا، گہرائی میں۔ بارش میں بھیک کر چٹان پر یکایک سبز کائی زندہ ہو کر بے حد پھسل والی ہو گئی تھی۔ اور اب کسی بھی لمحہ توازن کھو کر مجھے اس پر سے نیچے پھسلنا ہے..... گزنا ہے۔ عجیب ہولناک کرب کی سرد لہٹ میں دل ڈوب جا رہا تھا.....

کنڈکٹر میرے پاس پہنچ گیا تھا۔ میں نے مٹھی کھولی۔ بچنے بچنے نوٹ ٹرڈر گیا تھا۔ کنڈکٹر نے برا سامنہ بنا کر لے لیا۔

”کہاں جاتا ہے؟“

”اپنے خوالوں کو قتل کرنے۔“

کنڈکٹر نے رک کر میری طرف دیکھا۔

”پلّوں“ میں نے جلدی سے سنبھل کر کہا۔

بقیہ ریزنگاری ہاتھ میں تھماتے ہوئے اس نے پھر ایک بار میرے چہرے کا جائزہ

لیا۔ اور پھر میرے برابر والے مسافر سے متوجہ ہو گیا۔ تین نشست والی بیخ پر میں سرے پر بیٹھا تھا۔ کھڑکی سے لگی تیسری سیٹ پر ایک مغمّ خاتون بیٹھی تھیں۔ ان کو ٹکٹ تھماتے ہوئے کنڈکٹر بولا۔

”تمہارا دوران کا ٹکٹ ایک ہی میں کر دیا ہے۔ وہ بھی پُلّوں جا رہی ہیں۔“

جا رہی ہوں گی۔ میں ان باتوں سے بے تعلق..... کوئی ہزار میل دور کی آوازیں

سن رہا تھا..... بیوی اور بیٹے کی آوازیں، جنہوں نے اسٹیشن پر اس بار بھی تاکید سے کہا تھا ————— ”دلی میں کام ختم ہوتے ہی لوٹ جانا..... سننا؟ پلٹ جانے کی کمت سوچنا“

وہ ڈرتے تھے، میں وہاں جاؤں گا تو جذبات میں بہہ جاؤں گا..... پہلے ہی بلڈ پریشر کا مریض۔

مگر میں نے اس بار چپ چاپ طے کر لیا تھا۔

میں پلٹ جا رہا تھا۔ اپنے ان خوالوں سے ہمیشہ کے لیے چھٹکارا پانے جو ہر بار مجھے کرب کے الاؤ میں دھکیل کر چلے جاتے ہیں..... کب سے سچھا کر رہے ہیں میرا... عالم..... سفاک۔

وہ خواب میرے پچھلے جنم کے ہیں۔

جب میں سترہ اٹھارہ برس کا تھا اور پلٹ سے کوئی ہزار میل دور رہتا تھا۔ ہر سال ”ابا“ آتی اور بھتیآ کے ساتھ، گرمیوں کے دو تین مہینے گزارنے اپنے آبائی وطن، پلٹ خرد جاتا۔ بلاناغہ۔ مگر وہ سلسلہ یک لخت ٹوٹ گیا جب وہاں کے سب لوگ جبراً سرحد پار بھجوا دیئے گئے..... ہر بات ختم ہو گئی۔

میں پھر کبھی پلٹ نہیں گیا۔ سرحد کے اسی طرف رہتے ہوئے بھی۔ ڈوری کو قلعہ سے

یک لخت کاٹ دیا۔

مگر پلٹ برابر میرے ساتھ لگا رہا۔ بچپن کے دنوں کے پلٹ کی خوب صورت تصویر ذہن میں محفوظ رہ گئی..... وہ میرے پہلے جنم کی تصویر تھی۔

مگر پھر اس تصویر کی ایک ایک تفصیل نے خوالوں کا روپ دھار لیا..... اور

پھر ساری عمر یہ خواب میرا قبا کرتے رہے۔ ہر بار تھیل میں پتھر پھینکتے رہے۔ میں سمجھتا رہا کہ وقت کے پاس پتھر مل کا ذخیرہ ہی ختم ہو جائے گا۔ اور اس کے ساتھ ذہنی، میکان بھی۔ مگر اس کی بجائے تھیل کا پانی سوکھ گیا۔ اب پتھر اڈ کر جذب کرنا مشکل ہو گیا۔

تھیل کی تہ پتھر مل کے ٹکراؤ سے دھکنے لگی۔ ہر خواب کے بعد چین و سکون کرب



کے الاؤ میں لاوا بن کر یہ جاتا۔

نیند غائب ہو جاتی۔ بستیوں کے پر سے، کسی پڑا سر پر پہاڑی کی گھماؤں سے گھنٹیوں کی مدھم آوازیں جھلنے آ جاتیں..... زخموں سے پُور، دکھوں میں ڈوبی ہوئی کراہیں..... اور پھر آخری پہر کے دم توڑتے اندھیرے میں، میری ہستی کا ذرہ ذرہ بکھر جاتا..... گم ہو جاتا خلاؤں میں، وسعتوں میں۔

کیا کسی نے مجھے دیکھا ہے؟..... کوئی نہیں بتاتا۔ کوئی ہے ہی نہیں وہاں..... سب میرے پاس سے جانے کب چپ چاپ کھسک گئے ہیں۔

خدا یا کب تک اس عذاب کو جھیلتا رہوں گا؟..... کب تک یہ خواب میرا تعاقب کرتے رہیں گے؟

میں سدھارتھ نہیں ہوں، نہ کوئی بودھیترا ہوں..... مجھے ایک اور جنم کیوں دیا؟۔۔۔۔۔ آج برسوں کی ہمت جمع کر کے جا رہا ہوں۔ اس جنم کے خوابوں کی ہر کڑی کو توڑ کر اپنے ہاتھوں سے دفن کر دینے۔

اور اب بس فرید آباد سے گزر رہی تھی۔ مگر یہ کون سا فرید آباد ہے! آہم کے باغوں کی ٹھنڈک اور مہندی کی باڑھوں کی مہک والی وہ صاف ستھری بستی کیا ہوئی؟ یہ سڑک تو بستی سے ہٹ کر جا رہی ہے۔ ہر طرف چھوٹی چھوٹی دکانیں، گنجان کا بکنا گھروندے، غلیظ مریاں، جوہڑ — اور ان کے پیچھے دور دور تک کارخانوں کے آتش فشاں — دھواں اگلتی ہوئی چنیاں!.....

بے وقوف! — ان چالیس برسوں میں زمانہ قیامت کی چال چلتا ہوا تاریخ کے دو ڈھائی سو سال طے کر گیا ہے۔ تو کون سے دور کی بات کر رہا ہے؟ — اس کے تو نشان بھی ریت کے بگولوں نے ریگزاروں کے سینے پر سے مٹا دیئے۔

وہ ٹھنڈک، مہک تو کبھی کی چمنوں کا دھواں بن چکی ہے۔ — دور..... جوہم میں شامل ہو جا۔ سڑکوں پر لوگوں کے سیلاب کے ساتھ بہتا جا۔ — ورنہ اکیلا

کے الاؤ میں لاوا بن کر یہ جاتا۔

نیند غائب ہو جاتی۔ بستیوں کے پرے سے کسی پڑا سا رابر پہاڑی کی گیمائوں سے گھنٹیوں کی مدھم آوازیں جگلنے آجاتیں..... زخموں سے پُور، دکھوں میں ڈوبی ہوئی کراہیں..... اور پھر آخری پہرے کے دم توڑتے اندھیرے میں 'میری ہستی کا ذرہ ذرہ بکھر جاتا..... گم ہو جاتا خلاؤں میں، وسعتوں میں۔

کیا کسی نے مجھے دیکھا ہے؟..... کوئی نہیں بتاتا۔ کوئی ہے ہی نہیں وہاں..... سب میرے پاس سے جانے کیا چپ چاپ کھسک گئے ہیں۔

خدا یا کب تک اس عذاب کو جھیلنا رہوں گا؟..... کب تک یہ خواب میرا تعاقب کرتے رہیں گے؟

میں سدھارتھ نہیں ہوں، نہ کوئی بودھی ستوا ہوں..... مجھے ایک اور جہنم کیوں دیا؟.. آج برسوں کی ہمت جمع کر کے جا رہا ہوں۔ اس جہنم کے خوابوں کی ہر کڑی کو توڑ کر اپنے ہاتھوں سے دفن کر دینے۔

اور اب بس فرید آباد سے گزر رہی تھی۔ مگر یہ کون سا فرید آباد ہے! آہم کے باغوں کی ٹھنڈک اور مہندی کی باڑھوں کی مہک والی وہ صاف ستھری بستی کیا ہوئی؟ یہ سڑک تو بستی سے ہٹ کر جا رہی ہے۔ ہر طرف چھوٹی چھوٹی دکانیں، گنجان کا بکنا گھروندے، غلیظ مریاں، جوہڑ — اور ان کے پیچھے دور دور تک سکارخانوں کے آتش فشاں — دھواں اگلتی ہوئی چیمینیاں!.....

بے وقوف! — ان چالیس برسوں میں زمانہ قیامت کی چال چلتا ہوا تاریخ کے دوڑ دھائی سو سال طے کر گیا ہے — تو کون سے دور کی بات کر رہا ہے؟ — اس کے تو نشان بھی ریت کے بگولوں نے ریگزاروں کے سینے پر سے مٹا دیئے۔

وہ ٹھنڈک، مہک، توکھی کی چیمینوں کا دھواں بن چکی ہے — دوڑ..... ہجوم میں شامل ہو جا۔ سڑکوں پر لوگوں کے سیلاب کے ساتھ بہتا جا — ورنہ اکیلا

”اس جگہ شرک پر دونوں جانب بڑے پڑنے تناؤ در درخت ہوا کرتے تھے..... بڑکے  
.....؟ ”یکایک میں ساتھ والی خاتون سے پوچھ بیٹھا۔

”گر گئے۔ کبھی کے۔ ایک بہت بڑی آندھی آئی تھی..... طوفان۔“

گر گئے!..... کیسے گر گئے؟ میں نے ہمیشہ یہی سمجھا تھا، ان کی بڑیں زمین  
میں اتنی مضبوط ہیں کہ کبھی ہل بھی نہیں سکتے..... مگر وہ گر گئے۔!

وہ پہلے جہنم کا داہمہ تھا..... اور یہ اس جہنم کی حقیقت۔  
”آپ باہر سے آئے ہیں؟ ادھر..... دوسری طرف سے؟“  
”نہیں۔ ادھر ہی سے آیا ہوں۔“

وہ حیرت میں ڈوب گئی۔

”بہت دیر بعد آئے ہیں؟“

”چالیس برس بعد۔“

”تو اب وہاں کس سے ملتا ہے؟“

”وہاں کے گلی کوچوں سے“ فرش دیوار سے.....“

وہ دیر تک خاموش مجھے تکتی رہی۔ اس کی آنکھوں کی گدلاہٹ اور زرد ہو گئی تھی۔  
میرے ہاتھوں کی انگلیاں ایک دوسرے میں پھنسی ہوئی تھیں اور میں انہیں زور سے  
بھینچتا گیا۔ یہاں تک کہ درد سے ٹرپ اٹھا۔

”اب کیا ملے گا دیکھنے کو؟ کون سی گلی، کون سا فرش پچان سکو گے؟ سب  
کچھ بدل گیا ہے!“

میں نے کوئی جواب نہیں دیا۔ دل میں پورسی اٹھی..... پگلی۔ یہی تو دیکھنے

جار ہوں۔

”کون سا محلہ تھا؟“

”خیل۔ خیل کلاں۔“

وہ چونک گئی۔ ”میر صاحب کا مکان؟“..... اور پھر جیسے خود ہی جواب

ہاگئی ہو۔" میں وہاں جایا کرتی تھی..... اوپر کا چوبارہ - پکا کوٹھا، کچا کوٹھا..... اندر اور باہر کا نورہ..... سب یاد ہے مجھے۔"

زرد، گد لے پانی میں اُچلے نقطے سے جھلکانے لگے۔

"مگر تم..... آپ کہاں رہے اتنے دن؟"

\_\_\_\_\_ اب تمہیں کیا بتاؤں کہاں رہا! میں چپ رہا۔ وہ بھی خاموش ہوگئی۔ میری آنکھوں میں یوں دیکھے جارہی تھی جیسے کتاب کا کھلا صفحہ پڑھتی جارہی ہو۔

سنو۔ میں پہچان لوں گا۔ چالیس برس کے اُتھل پھتل کے باوجود مجھے سب یاد

ہے..... ٹیبلے پر سب سے اونچا مکان، وہ اوپر چوبارے کی کھڑکی..... باہر چوک میں

بیرسجی کا مزار جس پر نانا ابا ہر جمعے کو ایک مشک ٹھنڈے پانی کی چھڑ داتے تھے.....

نیچے اتار پر اینٹوں کا فرش، پھر پتھروں کا چوڑا فرش..... ذاب صاحب کی کوٹھی، باہر

والی مسجد، کنواں..... اور پھر بستی سے نکلنے ہی شیر شام کے زمانے کا شہراہ..... بسوں

کا اڈہ..... حوض کٹورا اور میدانی کا قبرستان..... ہمارا آبائی قبرستان..... مجھے سب

یاد ہے۔ وہاں کے موسم، بادل، درخت، فاختائیں، ٹوٹرو، ہر تیل، نیل کنڈھ، ہڈ.....

ان کی آوازیں..... انہوں نے کبھی میرا ہاتھ نہیں چھوڑا۔

"تو آپ اپنے کو دکھ پہنچانے آئے ہیں۔"

"نہیں۔ مڑکھ کا ہمیشہ کے لیے گلا گھونٹ دینے کو۔"

وہ خاموش ہوگئی۔ کئی منٹ تک خاموش رہی۔

"سینے! میں ان دنوں کریمین ہوا کرتی تھی..... پھر ماں باپ نے غریب سے تنگ آکر

عیسائی مذہب اپنا لیا۔ ہتھیں میں چرچ تھا نا، مشن کا؟..... ان لوگوں نے مجھے پڑھایا

لکھایا، نرس کی ٹریننگ دی اور اپنے ہسپتال میں نوکر رکھ لیا..... میں آپ کے گھر

..... میر صاحب کے گھر انجکشن وغیرہ دینے بھی آیا کرتی تھی۔"

وہ پھر چپ ہوگئی۔ چہرے پر بھریں کا جال متمسک گیا تھا۔

"پھر جب محلے خالی ہو گئے اور..... خالی گھروں میں لوگوں کے ریوڑ اترنے لگے تو

میں کستوری بن گئی۔ لڑکے کو دلی میں ڈاکٹری میں داخلہ مل گیا۔۔۔۔۔ اب وہ اور اس کی ڈاکٹر بیوی یہیں سرہنہ روڈ پر ایک بڑا ہسپتال چلا رہے ہیں۔“

اور پھر حبيب چاپ میری آنکھوں میں بھلکتے ہوئے بولی۔ ”مگر..... اس وقت، آپ کے ساتھ بیٹھی ہوئی میں صرف کریمیں ہوں۔“

یہ کونسا امتحان ہے؟ ربر کو بھی کھینچتے جانے کی ایک حد ہوتی ہے۔۔۔۔۔ میری انگلیاں ایک دوسرے میں پیوست ہو گئیں۔

”پلول اب نزدیک آ رہا ہے۔ آبادی کوئی دس گنی ہو گئی ہے۔ اور باہر باہر سے نئی شرک نکال کر بسوں کا اڈہ اسی پر بنا دیا ہے۔ آپ میرے ساتھ یہیں اتریں گے۔ پھر میرے ساتھ رکش میں چلیں گے۔۔۔۔۔ پہلے میرے گھر۔ وہاں کچھ دیر آرام کریں گے۔ بیٹے اور بہو کے ساتھ کھانا کھا کر پھر چلیں گے۔۔۔۔۔ آپ کے محلے نیل کی طرف۔۔۔۔۔“

وہ اس اعتماد سے کہہ جا رہی تھی جیسے میں، نہیں، کہہ ہی نہیں سکتا۔ لیکن میں نے کہا ضرور۔۔۔۔۔ ”شکریہ، لیکن میرے پاس اتنا وقت نہیں ہے۔“

”کاش کہ کا وقت نہیں ہے؟ اتنا وقت تو ضائع کر چکے!..... چالیس برس کی تلافی کیا اس طرح آٹا فائنا میں کر دینا چاہتے ہیں؟..... ایسی کون سی جلدی آن پڑی ہے؟ اور پھر یک لخت چپ ہو گئی۔ شاید اپنے لہجے کی گری کو خود ہی بھانپ لیا تھا۔ مسکرا کر دھیمے سے بولی۔

”میں جانتی ہوں، آپ برا نہیں مانیں گے۔۔۔۔۔ میں سب سمجھتی ہوں۔“

پھر ہم بس سے اتر کر رکش میں چلے۔

”یہ آدمہر کر بلا کا میدان تھا۔۔۔۔۔ اب وہاں لارپوں کے کارخانے کھل گئے ہیں۔۔

..... اور یہ آدمہر بھنگیوں کی پوکھڑ ہے۔ اب تک رہ گئی ہے ذرا سی۔“

”آگے مینار دروازہ ہے۔۔۔۔۔ ہے نا؟“ یکایک میں نے پوچھا۔

”ہاں جی۔۔۔۔۔“ یہ جواب رکش ادا لے کا تھا۔

سرک چھوٹی اور تنگ ہو گئی تھی۔ دکانیں ابل پڑی تھیں۔۔۔۔۔ فاصلے ذرا سے

لگ رہے تھے۔ ہر گھر میں کئی کئی خاندان آباد ہو گئے تھے..... اجنبی چہرے، اجنبی آوازیں.....  
 رکشا پرانے تھانے کے پاس رک گیا۔ دائیں ہاتھ وہ پتھر والا فرش جانا تھا، اوپر چڑھائی  
 کی طرف..... ہماری حویلی کو۔ میں رکشے میں اتر گیا۔ اس نے کرایہ بھی نہیں دینے دیا۔ ہاتھ تھام لیا۔  
 ”اگلی دفعہ..... آپ پہلے ہمارے یہاں آئیں گے..... سیدھے..... وہ آگے  
 نیم کے برابر سے جو سڑک مڑتی ہے۔“

”جانتا ہوں۔ دی سوہنہ روڈ ہے۔“

”اسی پر ہمارا گھر ہے..... بیٹے کا ہسپتال“

”اچھا..... خدا حافظ..... اور شکریہ!“

وہ چپ چاپ مجھے دیکھتی رہی۔ شاید مجھے شکر یہ نہیں کہنا چاہیے تھا۔ اور  
 پھر رکشہ آگے بڑھ گیا۔

میں دائیں طرف فرش پر چلنے لگا۔ کچا کچھ بھرے ہوئے گھروں میں نرم آلود سانسٹا  
 تھا..... فاصلے کٹتے ہوئے..... ہر شے کی ہیئت بدلی ہوئی سی..... کوئی آشنا نہیں۔  
 کسی نے میرا استقبال نہیں کیا۔ نہ راستوں نے، نہ گھروں کی دیواروں نے..... نہ پرندوں کی آوازوں  
 نے۔ اینٹوں کے فرش کا ٹوڑا گیا۔ یہاں ٹکڑے پر کٹونائی کا گھر تھا جو ہر سال تاج محل کی شکل کا بہت  
 خوبصورت ایک تعزیہ بناتا اور محرم کے دن اپنے ہی ہاتھوں سے کر بلا کے میدان میں لے جا کر اُسے  
 مٹی میں دبا آتا..... دو دن تک چوتھرے پر بیٹھا روتا رہتا۔ اور تیسرے دن سے اگلے سال کا  
 نیا تعزیہ بنانا شروع کر دیتا۔

یہاں اب کون رہتا ہے؟ — ٹھیکر والا سے آیا ہوا کوئی شرارتی خاندان۔ میں  
 بیٹھک میں چلا گیا۔ ہم لوگ وہاں پنجاب کے کنارے مٹی کے کھلوانے بنتے تھے اور بالو بچی.....  
 یہاں بیٹھک میں ایک ادھورا تعزیہ اب تک جوں کا توں رکھا ہے..... کاغذ اور پتی چھٹ  
 گئے ہیں۔ مگر..... کھینچیاں دیسی ہی ہیں۔

————— تو جوں کا توں کہاں ہوا؟

میں فرش پر اوپر بڑھتا گیا۔ یہ ہمارے گھر کا راستہ تھا۔ سارے گھر بدل گئے تھے۔

ہمارا گھر بھی ..... مگر نہیں — اوپر چوبارے کی کھڑکی ابھی تک دیسی ہی تھی ..... یہی ہے ہمارا گھر۔  
 کھڑی دوپہر میں نانی اماں کچے کوٹھے میں سارے بچوں کو دیوچ کر سلا دیتی تھیں۔ مگر  
 میں بہانہ کر کے پڑا رہتا اور موقع ملتے ہی تکیے کے نیچے سے جونی چرا کر باہر بھاگ جاتا ..... ملائی  
 کی برف بچنے والا شاید میرے انتظار میں بیٹھا رہتا ..... برف کھا کر میں اوپر چوبارے  
 والی کھڑکی میں بیٹھ جاتا ..... اور تانگے میں ٹھیکری باندھ کر نیچے لٹکاتا۔

میں اتنی باتیں یاد کر رہا ہوں ..... اور وہ کھڑکی پہچان بھی نہ سکی مجھ ! ..... بالکل  
 اجنبی، غیر کی طرح دیکھ رہی ہے ..... شاید خفا ہے ..... کہاں چلا گیا تھا ؟  
 دل برداشتہ میں لوٹ گیا۔ چوبارے کی کھڑکی نے یا چاروں طرف سہمے ہوئے  
 سناٹے نے ..... میرے دل کی دھڑکن کو تیز نہیں کیا۔ نہ سانسوں کی رنڈا بدلی۔ لمحے  
 گزرتے گئے ..... اسی طرح جیسے ہمیشہ گزرتے ہیں۔

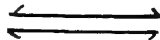
\_\_\_\_\_ اور پھر اسی وقت واپس ہو گیا۔ دلی جاتے ہوئے بس میں میں خوش تھا کہ  
 آج اپنے خوابوں کی آگ میں سے گزر کر اسے ٹھنڈا کر دیا ہے ..... ہمیشہ کے لیے۔ کتنا مشکل  
 سمجھ ہوئے تھا اسے ! ..... کتنا خوف زدہ تھا ! کتنے برس انتظار کیا تھا اس لمحے کا ! .....  
 لیکن کیا یہ لمحہ بھی میرے انتظار میں تھا ؟

\_\_\_\_\_ وہ مشترک ٹکٹ ..... سفید بالوں کے جھنڈکاڑ والی کریمین ..... یہ  
 مختلف تعدادوں میں اہمترانہ کرنے والے لمحے، ایک جگہ کیسے اکٹھے ہو گئے — ؟

اور پھر میں دلی سے بھی واپس آ گیا۔ ایک ہزار میل دور ..... اپنے شہر میں۔  
 ٹھیک گیا رہویں دن میں نے خواب میں پھر پلویں دیکھا ..... سچپن کا پلویں ! .....  
 .... وہی دیوار دور ..... وہی موسم، وہی پرندوں کی پردازیں ..... ان کی بولیاں  
 ..... میرا پہلا جنم۔

وہی آگ ..... وہی لاوا ..... مگر میں تو بدھا نہیں ہوں۔ بوڑھیتا تک نہیں۔

▲▲



## اکھڑے ہوئے لوگ

جب روشنیوں کے نقطے بھی اندھیروں نے نگل لئے تو کشتی میں کوئی بولا —  
 ”اب ہم نکل آئے ہیں“ —

کشتی کے اندر مکمل اندھیرا تھا، اندھیرا اور خاموشی۔ رقی برابر روشنی پر بھی گویوں کی بوچھاڑ شروع ہو جانے کا خوف بدستور طاری تھا۔ بس انجن کی چھٹک چھٹک اور کشتی سے نکلنے والی موجوں کی لپ لپ کے سوا، کوئی اور آواز نہیں تھی۔ اندھیرے اور سنائے کی دیسز دیوار تے سارے مسافر دم سادھے، سر نیڑے رکھے، خوف کی چادر میں لپٹے یوں بے حس و حرکت بیٹھے تھے کہ جیسے بھول چکے ہوں، وہ زندہ بھی ہیں۔

یہ ایک کسی نے جواب دیا — ”بے وقوف مت بنو۔ رائفل کاری منج تم جانتے ہو؟“

”شش..... شش..... شش“

اور پھر بس چھٹک چھٹک اور لپ لپ۔

وہ سب کوئی پچیس سے زیادہ نہیں تھے۔ حالانکہ ان کے چھوٹے سے گاؤں کی آبادی سو سے کم نہیں تھی۔ مگر کچھ من چلے، جو شیلے نوجوانوں نے گاؤں بھوڑنے سے انکار کر دیا تھا اور کئی ضعیف آدمیوں کو، جو آنے کے لئے کمر باندھے تیار بیٹھے تھے، نوجوانوں نے لانے سے کترا کر وہیں چھوڑ دیا تھا۔



وہ لوگ تڑکے، بھور کی پہلی سفیدی کے ساتھ نکل کھڑے ہوئے تھے۔ سارا دن گھنے جنگلوں میں سے درختوں گند اسوں کی مدد سے، سیلوں اور دشتوں کو ساٹ ساٹ کر چلتے رہے۔ اونچے درختوں کے سایوں میں دل لیں چھپی ہوئی تھیں۔ اور جہاں دل لیں نہیں تھیں، وہاں لمبے نکیلے کانٹے چیلوں کے تلوؤں میں گھسے جاتے تھے۔ پھر بھی وہ چلتے رہے۔ اسلئے کہ چلتے رہنے کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا !

اندھیرا ہونے سے پہلے انہیں ساحل تک پہنچ جانا ضروری تھا۔ ورنہ پھر کشتی کا انتظام کون جانے کبھی ہوگا بھی یا نہیں !

وہ لوگ سستلے، یا کچھ کھانے پینے کے لئے بھی نہیں رکے، بس کبھی کبھی رفتار سست کر کے سانس درست کر لیتے۔ اور بس۔ سب ایک ہی گاؤں کے تھے، اور سب نے دل کر ہی نکل چلنے کا فیصلہ کیا تھا۔ مگر اس وقت سب اجنبی بنے ہوئے تھے۔ کسی کو کسی کی نگرانی نہیں تھی۔ بس اپنی۔۔۔۔۔ صرف اپنی فکر تھی۔

سب چپ تھے۔ کھسر کھسر کرتے بھی ڈر رہے تھے۔ کہیں کسی کو پتہ نہ چل جائے ! راستے میں کہیں کوئی گاؤں بڑا تو یہ لوگ دور ہی سے کتر کر نکل جاتے۔

وہ کالا کلونا، ناٹے قد والا، ان سب کا راہ بر تھا، جس کے سر پر سفید پگڑی تھی۔ اور جس نے پنچھی کو اوپر رانوں تک اٹس رکھا تھا۔

”سی کو سامان ساتھ لے چلنے کی اجازت نہیں تھی۔۔۔۔۔“

”جانیں، بچائی ہوں تو پھر طے پھاٹ چلنا ہوگا۔۔۔۔۔“ سمجھے؟ اس نے کہا تھا۔ اور بس زیادہ سے زیادہ ایک ایک چھوٹا سا بیگ ان لوگوں نے لے رکھا تھا۔ اس سوکھے سوکھے ہاتھ پیر اور لمبے بالوں والے زجران نے تو بس ایک گٹار ساتھ رکھی تھی۔ اس کی غلافی آنکھیں سدا مسکراتی لگتی تھیں، اسی لئے کوئی ان کو راست دیکھنے کی جرات نہیں کرتا تھا،۔۔۔۔۔ پتہ نہیں

وہ اسی پر ہنس رہی ہوں !

بس ایک جگہ، ایک پھوٹے سے گاؤں سے بچ کر نکلنے وقت انہیں تھوڑی دیر کے لئے رک جانا پڑا تھا۔ انناس اور تاریلوں کے بھٹنٹلے ایک نوجوان ان کے انتظار میں کھڑا تھا۔۔۔ اپنے کتے کے ساتھ۔ یا پھر وہ سندری اس کے انتظار میں تھی، جو اپنے بتا کے ساتھ اس تلنے میں آ رہی تھی۔ دونوں دیوانہ وار ایک دوسرے سے چمٹ گئے۔ اور کتا دم بلانے لگا۔

”وہ ہمارے ساتھ نہیں چلے گا۔ وہ دوسرے گاؤں کا ہے۔“

”وہ کوئی جاسوس نہیں ہے“ سندری کا پتا بولا۔۔۔۔۔ دشا اس رکھو۔ وہ میری بیٹی کے لئے اپنا پر لوار چھوڑ کر آ گیا ہے۔۔۔۔۔ ساتھ ہی چلے گا۔“

”مگر اس کا پر لوار۔۔۔۔۔؟“

”چننا مت کرو۔۔۔۔۔ اس نے کسی کو بتایا نہیں ہے“

اور بتا کی آنکھوں میں دشا اس کی جمیل نے سب کے خوف اور شبہ سے جذب کر لئے قافلہ پھر اسی طرح چلنے لگا۔۔۔۔۔ خاموش۔ اپنے اپنے خیالوں میں گم۔

اینا وطن چھوڑ کر انہوں نے ٹھیک کیا یا۔۔۔۔۔؟ اور خوف کی بریلی پھری جسم میں اترتی چلی جاتی۔ مستقبل کی آشوبش، بے یقینی، بے تحفظی کا کبرا ذہن کو پریٹ لیتا۔

وہ کہاں جا رہے ہیں؟

”ہم اپنے وطن جا رہے ہیں۔“ کسی نے کہا تھا، نکلنے سے پہلے۔

”سارے۔ وطن تو اپن کا ہی چ ہے۔“

”اے نئی اے رہے۔ اپن کا موک، ادھر سمندر پا ہے۔“

”نئی نئی۔۔۔۔۔ یہی چ ہے۔ اپن یہیں چ جتم لئے رہے نا؟“

”پر اپن کے گریڈ نادرس ادھر سے آئے تھے۔“

”وہ ہزاروں برس پہلے آئے ہوئیں گے۔۔۔۔۔ اب کہ بات کیوں نہی کرتا رہے؟“

”مگر موک میں دوسرے موک کے لوگ آتے رہے۔۔۔۔۔ بستے رہے۔۔۔۔۔ ہے نا؟“



قدم زمین میں گر گئے ————— ”چلتے چلو..... میں نے خود دیکھا تھا“

کچھ دور سب چپ چاپ چلتے رہے....، کھوے کھوے سے۔ ہر قدم انہیں گھر سے دور لے جا رہا تھا۔ یکایک کوئی بولا:

”گولیاں کس نے چلائی تھیں؟“

”دشمنوں نے“ کسی نے جواب دیا۔

”نہیں۔ وہ اپنے سپاہی تھے۔“ کوئی اور بولا۔

”اپنے؟ ————— ہونہہ!“ اور ایک ہندیائی منہی کا قوارہ چھوٹا۔

”کون اپنا ہے، اور کون دشمن ————— کیا تو جانتا ہے؟..... سالا۔“

”کوئی اپنا نہیں —————“ پھر لے ہوئے رانوں اور کھانسی کے جھٹکوں میں الجھ

کوئی ضعیف آواز آئی ————— ”نہہ وہ جو آزادی دلانا چاہتے ہیں۔ اور نہہ وہ..... جو

ہیں بچانے آئے ہیں۔“

سب چپ ہو گئے۔ مگر پھر وہی آواز آئی ————— ”گولیاں کس نے چلائی تھیں۔“

”کیا فرق پڑتا ہے۔ ہم دونوں کی زد میں ہیں۔“

”بے وقوف..... سراسیمہ چپ نہیں رہ سکتے؟“

”میں تو سوچ رہا تھا گولیاں کس نے.....“

”شش..... شش..... سوچ رہا تھا.....“ الو کے پیٹھے۔ سوچتا تو سارے

ملک میں کب کا بند ہو چکا ہے!..... تجھے سوچنے کی پڑی ہے تو مر جا کے..... جا..... جا.....

————— اور پھر وہی ہندیائی قہقہے کا قوارہ چھوٹا۔

————— اور پھر جب گھنے جنگل اور پہاڑوں کی دیوار کے پیچھے سے سمندر کی لہر اور

آواز آئی تو ادھر مرے چہرے پر زندگی کی پھوار برسی۔ ایک نے دوسرے کو دیکھا۔

آنکھوں کے کناروں میں ایسے دل کو پھر ٹھٹھانے لگی —————

مگر وہ، جس کے دل میں گھر سے نکلنے وقت سرد چھری اترتی چلی گئی تھی پھر ایک بار بول کر فیلی ہر میں منجھو کر رہ گیا — کیا اب صبح پنج چلا جاتا پڑے گا — اُ! مگر وہ چپ رہا۔ اپنے ساتھیوں سے اسے ڈر لگنے لگا تھا۔ جو صبح کو نکلنے وقت دوست تھے اس وقت وحشی درندے لگ رہے تھے۔ کھینچے ہوئے تار کا تار اُنا نیت کے سوتے بند کرتا رہا تھا۔ اور پھر سوچنا تو سب نے کب کا چھوڑ دیا تھا!

”چلو۔ سب جا رہے ہیں“ اس کے کان میں پھر وہ آواز گونجی۔

”مگر کہاں ..... اور کیوں؟“

”پوچھو مت، یہ ملک پھوڑ دینا ہے۔“

”مگر یہ تو اپنا گھر ہے۔“

”اب نہیں ہے — کل صبح ہم سب جا رہے ہیں“

”کہاں؟“

”اپنے ملک۔“

”مگر وہ اپنا ملک کہاں؟ — میں تو یہیں پیدا ہوا تھا، ..... میرا باپ بھی

..... اور اس کا۔“

”بکو اس مت کرو۔ کل صبح پوچھنے سے پہلے ..... نہیں تو اکیلے مرنا پڑے گا۔“

”ہم اکیلے نہیں مریں گے بالو —“

”نہیں۔ اکیلے نہیں، سب کے ساتھ مریں گے۔“ اور ساری رات گاؤں بھر کے

ساتھ انہوں نے بھی آنکھوں میں کاٹ دی۔

اور اب چٹانوں پر سر ٹیکتی لہروں کا شور کان پھٹاڑے ڈال رہا تھا۔ سمندر کی ہلکی

اور مخصوص بو نٹھنوں میں گھسی جا رہی تھی۔ کچھ دُور ریت کا ساحل بھی تھا۔

مگر کشتی کا کہیں پتہ نہیں تھا۔

اور سورج پہاڑوں کے پرے اترتا جا رہا تھا۔

اور اگر کی میلا ہٹا میں سبز رنگ گھلتا جا رہا تھا۔ اور جہاں دو نل نیلا ہیں ایک ہو گئی تھیں، وہاں سے آبی پرندوں کی قطاریں ساحل کو ٹوٹی شروع ہو گئی تھیں۔

مگر کشتی کا کہیں پتہ نہیں تھا۔ سب جہاں کے تہاں، چپ چاپ بیٹھ گئے۔ سندری اور ذہ نرجوان احمد کھڑے بھی۔ مگر جو سوال سب کے ذہنوں میں دھک رہا تھا، کسی کی زبان سے اُٹا نہیں۔

”مگر اس کو آ جانا چاہیے تھا۔“ بونے قد والا بولا۔ ”اور جگہ بھی ہی ہے۔“ اور جگہ دی گئی تھی۔ کشتی بھی آچکی تھی۔ ملاح نے اسے پچاٹن کی آڑ میں چھپ رکھا تھا۔ اب جو نکال کر سامنے لایا تو سب دوڑ پڑے۔ ہر ایک کو کشتی میں پہلے بیٹھنے کی جلدی تھی۔ پانی میں گرنے اور بھیگ جانے کا بھی ہوش نہیں تھا۔

پیشی والے کھوٹے نے ملاح کو نوٹوں کی گڈی بتائی اور جلدی سے موٹر اسٹارٹ کرنے کے لئے پیچھے لگا۔ جلدی..... جلدی.....

اور جب چھگ چھگ کی آواز میں کشتی سرکنے لگی تو سندری چیخ اٹھی۔ نرجوان کو کھوٹے بونے نے کشتی میں آنے نہیں دیا تھا۔ وہ ساحل پر ہی کھڑا تھا، اور اس کے بھی پیچھے دور، اس کا کتا۔

”نئی..... بالو۔ اس کو بھاڑ۔ نئی تو میں بھی نئی جاؤں گی۔“

”اور پھر اس نے روپے بھی نہیں دیئے۔“ پیشی والا ملاح کو سمجھا رہا تھا۔ مگر ملاح جانتا تھا، یہاں تک اگر وہ واپس اپنے گاؤں زندہ نہیں پہنچ سکتا۔ ادھر کشتی میں اس دفعہ اس نے زیادہ ہی لوگ ٹھونس لئے تھے..... جہاں میں مرغیوں کی طرح۔ پھر بھی اس کے دل نے پیچھے کے لئے زیادہ دقت نہیں لیا۔

”بالو اسے بھی..... سال۔ یاد کرے گا زندگی بھر۔“

مگر جب کشتی میں چڑھنے لگا تو نوجوان کو کتے کا خیال آیا، جو دو ساحل پر بیٹھا دم ہلاتا رہا تھا۔ اور وہ اسے بلانے کے لئے لوٹ گیا۔

”نہیں — کتا نہیں۔“ ملاح چینی۔

اور سندری چینی — ”دایس آجاؤ انتم“ —  
مگر انتم کتے کو بلاتا رہا۔ اور کتا پتہ نہیں کرسا، اپنی جگہ سے ہلا بھی نہیں۔ اب اس نے پلاٹ کر بھونکنا شروع کر دیا تھا..... اور کشتی دور ہوتی جا رہی تھی۔

اور اسی وقت ایک گولی چلی، اور انتم ساحل کی خشک ریت پر ڈھیر ہو گیا۔ کتا بے قرار ہو کر کوں کوں کرتا، انتم کے پاس آیا — ایک اور گولی چلی۔ اور کتا بھی ڈھیر ہو گیا۔ کشتی دور ہوتی جا رہی تھی۔ اور سندری کی چیخیں بھی۔ گولیاں بھی برابر چل رہی تھیں۔

تھوڑی تھوڑی دیر میں کوئی بڑی سی ہلر ریت پر دور تک دوڑ جاتی تو نوجوان اور اس کے کتے کو ہٹا کر ساگر میں لوٹ جاتی۔

کشتی دور ہو گئی تھی۔

کون کتنا زخمی ہوا تھا..... زندہ بھی تھا یا مر چکا تھا، کسی کو خبر نہیں تھی، اور نہ فکر تھی۔ اندھیرا بڑھتا جا رہا تھا..... اور سب کو فکر تھی تو یہ کہ جلد سے جلد اندھیرا نہیں نکلے۔

اور جب اندھیرے نے انہیں بلوری طرح ڈھک لیا تو بھی ڈر کے مارے کسی نے بڑی تک نہیں جلائی۔ سب کو اپنی فکر تھی۔

اور پھر اسی اندھیرے میں ملاح اور کالے کلمے نے مل کر ان سب کو سمندر میں لڑھکا دیا جن کو گولی لگی تھی۔ ملاح نے کہا کہ دیکھنے کی ضرورت نہیں، وہ مر چکے ہیں، یا صرف زخمی ہوئے ہیں۔ اور عجیب بات یہ تھی کہ اس کام میں ان کی مدد کشتی کے دوسرے مافز بھی کرنے لگے۔

اور اب دور اندھیرے میں ساحل کی طرف کچھ روشنیاں نظر آرہی تھیں۔ کشتی کو طلاح نے سمندر میں کچھ اور اندک کی طرف دھکیں دیا۔ انجن کی چھگ چھگ بھی دھیمی کر دی، سمندری کی ہچکیاں بھی بند کرادیں۔

اور جب روشنیوں کے نقطے بھی اندھیروں نے نگل لئے تو کشتی میں کوئی بولا۔  
 ”اب ہم نکل آئے ہیں۔“

”کیا ہم نکل آئے ہیں؟“ مگر وہ پھر چونک گیا۔ سوچنا بند ہو چکا ہے، یہ بات اسے ہمیشہ یاد رکھنی چاہیے۔ اس نے آنکھیں بند کر لیں۔

بس خاموشی۔ اور موٹر کی چھگ چھگ، جس کے بغیر خود خاموشی غیر مکمل لگتی تھی۔ تاروں کی چھاؤں میں، اور سمندر کی غمی میں بھگی ہوا کے جھونکوں میں، لوگ ادھنگے لگے۔  
 .... سو بھی گئے تھے۔ صبح سے نکلے جسم اور ذہن ٹھکن اور خوف سے بے جاں ہو چکے تھے۔  
 بھوک اور پیاس کا بھی ہوش نہیں رہا۔

کبھی کئی ذہن یکساں کی زندگی بھٹک کر بیدار ہو بھی جاتا تو وہی برفیلا خوف اسے پھر منہ بند کر دیتا۔ وہ کہاں جا رہا ہے؟ کیوں جا رہا ہے؟ آگے کیا ہے؟ اور گرداب کا مرکزہ آپ ہی آپ اسے اندر ہی اندر کھینچ لیتا۔ گھسیٹ لیتا، نگل لیتا۔

پچھلے بہرستاروں کے چہرے تپ ہو چلے تھے۔ زہرہ کی آنکھ سے بھی برقانہ دہشت ٹپک رہی تھی۔ سہمی سہمی ہوا کے ذروں میں بس وہی موٹر کی چھگ چھگ.....  
 حالانکہ انہی پر بھر ایک نئی صبح کی تیاریاں شروع ہو رہی تھیں۔

اور کچھ ہی دیر بعد جیسے جیسے آسمان کی پیشانی پر یکے بعد دیگرے ساتوں رنگ جھلکے گئے، سمندر کے پانی بھی رنگوں کی پنسلوں سے اپنے روپ کی نوک ہلک سنوارتے گئے۔

اور آخر میں اپنی نیلا ہٹوں کی کر دٹ کر دٹ میں چاندی کی کرچیں بھر دیں۔  
 مگر کشتی کے مسافروں کے چہروں پر سب دہشت کی لہری نہیں جاسکی۔ اب ان کے



دلوں میں آنے والے لمحوں کا خوف تھا۔ مستقبل کی تشویش تھی۔

اپنا دروازہ بند کر کے انہوں نے اپنے ہاتھوں سے کنڈی لگادی تھی۔۔۔۔۔ وہ گھر اب غیر ہو چکا تھا۔ اب ایک نئے دروازے کی کنڈی کھٹکھٹاتی ہے، تو کیا۔۔۔۔۔ یہ گھر غیر نہیں ہو گا؟۔۔۔۔۔

لمحہ بہ لمحہ وہ گھر کے قریب ہوتے جا رہے تھے۔

سورج کی بھٹی میں ایندھن بڑھتا جا رہا تھا۔ اور دھرتی کے سینے پر زندگی بھلسی جا رہی تھی۔۔۔۔۔ بس سمندر، اور موٹر کی چمک چمک! کہیں وہ راستہ تو نہیں بھٹک گئے تھے! مگر اسی لمحے انہیں افق پر حرارت کی لہروں کے غبار میں آلودہ عمارتوں کے سرے نظر آنے لگے۔۔۔۔۔ وہ لمبا چوڑا اور ادنیٰ شہر جس کا دل بھی اتنا ہی بڑا تھا۔۔۔۔۔ جہاں انہیں جانا تھا۔ جہاں ان سے پہلے بھی ہزاروں خاندان پناہ لے چکے تھے۔۔۔۔۔ ان کا نیا گھر۔۔۔۔۔

کشتی بڑے شہر کی طرف سہمی سہمی، سمٹی سمٹی یوں بڑھ رہی تھی جیسے کوئی دیہاتی پہلی بار شہر آ رہا ہو۔

اور پھر دوسری کشتیوں اور چھوٹے بڑے جہازوں کے جھرمٹ سے بہت پہلے ہی سمندر میں ان کی کشتی کو درک دیا گیا۔ بحری فوج کی ایک سفید موٹر بوٹ یک لخت کہیں سے نمودار ہوئی۔ اس پر جھنڈا بھی لہرا رہا تھا۔ اس نے کشتی کو رک جانے کا سگنی کیا۔ سفید دردی والے انسر نے کشتی میں آ کے ایک ایک کے چہرے کا جائزہ لیا۔۔۔۔۔ پھر دھیمی مگر جیتھتی ہوئی آواز میں پوچھا۔۔۔۔۔ ”تم میں مہادیون کون ہے؟“

کسی نے جواب نہیں دیا۔ کوئی جانتا بھی نہیں تھا، مہادیون کون ہے۔ تیسری بار انسر کی آواز میں دھمکی اور تلوار کی کیٹیلی تیز دھار شامل ہو گئی تھی۔ سہمے ہوئے چہروں سے رنگ غائب ہو گیا۔ لمحے من من بھر کے ہو کر معلق ہو گئے۔۔۔۔۔ ایسے میں گٹا دالا نوجوان

اپنی لمبی لمبی ٹانگوں سے آگے بڑھا۔ اس کی غلافی آنکھیں اب بھی سکر رہی تھیں۔

اور جب وہ جھنڈے والی سفید موٹر بوٹ، اس کے ساتھ واپس لوٹ گئی تو ملاح نے کشتی میں خوف زدہ چہروں اور حیران آنکھوں کی طرف دیکھا۔

”ہاں۔ انہیں معلوم ہو جاتا ہے۔ جب بھی کوئی کشتی ریونیو جیوں کو لے کر آتی ہے۔ انہیں سب معلوم رہتا ہے۔۔۔ اس میں کون آ رہا ہے!“

شام ہو گئی مگر ان کی کشتی کو ساحل پر آنے کی اجازت نہیں ملی۔ بے بسی اور امید و بیم کی عجیب اور میسر بن میں وہ رات گئی۔

اور جب صبح ہوئی تو وہی موٹر بوٹ انہیں اطلاع دے گئی کہ اب ان کی حکومت اور پناہ گزینوں کو اپنی زمین پر اتارنا نہیں چاہتی۔ لہذا وہ لوگ وہاں نہیں اتریں گے۔

سب سن سے ہو گئے۔ جیسے سانپ سونگھ گیا ہو۔ مگر ہم تو یہیں کھائے آئے تھے!“ کہنا چاہتے تھے، مگر آواز اٹک کر رہ گئی۔

پچھلا پورا دن استوائی سورج کی آہٹ کی راست پلیٹوں میں گزرا تھا۔ اور ان میں جھلس کر کئی مرد اور عورتیں اپنے سفر کی منزل تک پہنچ چکے تھے۔ مگر ان کی فکر کرنے والا کوئی نہیں تھا۔ سب وحشت زدہ نظروں سے ایک دوسرے کو دیکھ رہے تھے۔ ہونٹ سوکھ کر ترنہ خنہ لگے تھے، کالے چہروں پر سرخ چمکیاں پڑ گئی تھیں۔ تو کیا آج کا دن بھی کشتی میں گزارنا پڑے گا!“

ملاح نے اشارے سے ایک کشتی کو بلایا، اور اس میں وہ کالے کلوٹے ٹھنگنے کے ساتھ ساحل پر چلا گیا۔ وہ لوگ چار پانچ گھنٹے بعد واپس آئے۔ ”مجوری ہے ہمیں اور آگے جانا پڑے گا۔۔۔۔۔ ادھر اتر میں۔۔۔۔۔“ کہتے کہتے ایک لخت رک کر دیکھا کہ کشتی میں کچھ لوگ اور کم ہو گئے ہیں! اور پھر جلدی سے بتایا۔ ”چہنماست کرد۔ ہم راشن لے آئے ہیں۔“

مگر فکر راشن کی نہیں تھی۔ جس امید کو لئے گھر سے نکلے تھے، اس کے یوں چکنا چور ہونے کی فکر تھی۔

وہ پھر چل رہے تھے۔ چھگ چھگ، اور کشتی سے لہروں کے ٹکرانے کی لپ لپ کے سوا پھر وہی خاموشی چھا گئی۔

مگر جلد ہی یہ خاموشی سمندری طوفان کی پُرمول آوازوں میں بدل گئی۔ دیکھتے ہی دیکھتے، سارا سمندر تہہ وبالا ہونے لگا۔ پر شور ہواؤں میں لہروں کے پہاڑ بن بن کے بہے جا رہے تھے۔ معمولی موٹر بوٹ کی بساط ہی کیا، کئی بھی بلی دم توڑ کر مری ہوئی ٹھہلی کی طرح الٹی ہو جاسکتی تھی۔ موت کے سائے میں سب لگ دم رد کے بیٹھے رہے۔ اور پھر ایک ہیب لہر، چینی ڈریگن کی طرح منہ کھولے آئی اور دندانہاتی ہوئی کشتی میں سے گذر گئی۔ اور ساتھ میں ان سب کو لے گئی جو اس کے تھپیڑوں کی زد میں تھے۔

کوئی دو گھنٹے بعد جب طوفان تھا، تو ملاح اور کلرٹا بونا ایجن اور اسٹیرنگ چھوڑ کر نیچے فرش پر پڑ گئے۔۔۔۔۔ بے جان بے سدھ۔ سانسوں کی دھونکنی زور زور سے چل رہی تھی۔ اب کشتی میں بہت کم لوگ رہ گئے تھے۔ سمندری بھی لہر کے تھپیڑے کی نذر ہو گئی تھی۔ بچے کچے لوگوں کے ستے ہوئے چہروں سے ڈر لگ رہا تھا۔ پتہ چلا نا مشکل تھا کہ زندہ بھی ہیں یا ذرا سے دھکے سے لڑھک جائیں گے!

اور پھر وہی شام کا اندھیرا پھیلا، رات آئی۔ اور تاروں نے پھٹی پھٹی آنکھوں سے اس چھوٹے سے لڈرے مڈے تانے کو دیکھا، جو وطن سے چلا تھا، وطن کی تلاش میں۔ ملاح نے اندھیرے میں کلرٹے سے سرگوشی کی۔ ابھی خطرہ ٹانہیں تھا۔ اور صبح کے ساگر میں ایسے ہی طوفان آتے رہتے ہیں۔

مگر سمندر میں طوفان پھر نہیں آیا۔ البتہ کشتی کے اندر طوفان اس وقت مچا جب صبح کو انہیں پھر اس بڑی بندرگاہ پہ اتارنے نہیں دیا گیا، جہاں وہ پہنچے۔ اور جہاں رہ کر بھی وہ خود کو

تسلی دینے کے لیے تیار تھے کہ اپنے وطن سے دور نہیں ہیں، مگر اجازت نہیں ملی۔  
 الو کے پٹھو، وطن کی چوکھٹ ایک یار الاٹنگ کر آدمی بے درست دیا ہو جاتا ہے  
 .... اور تم تو گھر کا دروازہ بند کر کے کندی بھی لگا آئے، مردودو۔ تم مر چکے ہو۔ اور۔۔  
 مردہ بہ درست زندہ، کیا اتنی بات نہیں جانتے؟ سالو؟ وہ ادھ مواسا کشتی  
 کے ایک کونے میں پڑا تھا، سب کو اپنی بات زور زور سے سناتا بھی چاہتا تھا، اب  
 اسے کسی کا ڈر نہیں تھا، مگر کہہ نہیں سکا۔ کمزوری نے ٹڈھال کر دیا تھا۔

انہیں بڑا ہلی، تیسری بندرگاہ میں۔ سوہیہ دیوتا کے چرلوں میں۔ وہاں سے بھی انہیں اندر  
 علاقے میں بھیج دیا گیا۔ جہاں تاریک جنگلوں میں قبائلی رہتے تھے۔ اجنبی چہرے، اجنبی  
 زبان، اجنبی رہن سہن ..... سب اجنبی!

غیب بات تھی، سات آٹھ مسافر جو یہاں تک پہنچ پائے تھے، ان میں ایک دو کے  
 سوا سب بوڑھے تھے ..... یا پھر شاؤ بوڑھے ہو چلے تھے۔

سندری کا پتا بھی زندہ لاش کی طرح سرکاری انسروں کے ساتھ دین میں سے اُترا۔  
 گاؤں کے رنگ دھڑنگ بچے اس کے گرد جمع ہو کر تعجب اور دل چسپی سے دیکھ رہے تھے۔ مگر ان  
 کے پیچھے کھڑے ہوئے ان کے بڑوں کی آنکھوں میں نہ تعجب تھا، نہ دل چسپی۔ وہاں غصہ تھا!  
 پھوڑی پھوڑی ناکوں کے نتھنے اور پھیل گئے تھے۔

”ادھر دیکھو .... کیا نام ہے تمہارا؟ .... وہاں ندی کے اس طرف تمہیں دس ایکڑ زمین ملے گی۔  
 جنگل صاف کر کے کھیتی باڑی کرنا۔ اور ہاں۔ کل سرکاری مزدور بانس اور ٹٹیاں  
 لاکر تمہارے لئے ایک .... گھر بنادیں گے۔ تمہیں یہیں رہنا ہے .....  
 سن رہے ہو؟“

ایک ایک سندری کا باپ ہلنے لگا۔ ہنستا چلا گیا .....  
 دیوانہ وار تھپتھپے ..... ایک کے بعد دوسرا ..... دوسرے کے بعد تیسرا !

## آٹھواں سفر

اس رات سند باد بہت مسرور تھا کہ اس کے دسترخوان پر مہمانوں کی تعداد یہ کچھ زیادہ ہی تھی۔ خاصہ بڑھاد یا گیا۔ بڑی بڑی قالوں اور چینی کے منقش باد یوں میں اندس اور انقرہ کے باغوں کے انگور اور سیب لائے گئے۔ آبنوسی جسم والے سجیلے حبشی غلاموں کے قدم سرخ ایرانی قالینوں کی دبازت میں دھنسے جا رہے تھے۔

اطلسی غلاف والے گاڈ تکیے پر کہنی کے بل جھکے ہوئے سند باد جہازی نے ایک نظر مہمانوں پر ڈالی، اور حیرانی کا ہلکا سا سایہ چہرے پر کونڈ گیا۔ محل کی واسکٹ میں سے چاندی کی گول ڈبیا نکالی اور اس میں سے سنہری ورق میں لپٹا ہوا ایک موتی نکال کر سنہ میں ڈال لیا۔ رات کے کھانے کے بعد سند باد کی یہ عادت صدیوں سے چلی آ رہی تھی۔

حیرانی کی بات اس رات یہ ہوئی کہ وہاں اسے ہر رنگ اور نس کا چہرہ نظر آیا..... چپٹا سیاہ نام، سیاٹ نمقنوں والا چہرہ، خزاں رسیدہ پتے کی طرح مرجھایا ہوا زرد چہرہ، مل گئی مٹیا لاچہرہ، جس پر آسیب زدہ ویرانی برس رہی تھی۔ ستواں ناک اور تیکھے نقوش والا چہرہ، جو کبھی خاصا دلکش رہا ہو گا..... مگر اب اس کا پاکیزہ رنگ مکر رہ چکا تھا۔

سند باد نے دیکھا کہ سارے چہروں میں آنکھیں اپنی چمک کھو چکی تھیں..... بے جان مردہ..... پتھر کی سی مصنوعی لگ رہی تھیں۔ اس کی حیرانی اور بڑھ گئی۔  
دلکش، ستواں ناک والے چہرے نے کہا ”اے سند باد! ہمیں دیکھ کر یوں حیران نہ ہو۔ ہم بھی کبھی تیری طرح معمول میں رہتے تھے۔ ہماری طاعت کے لیے غلام ہوا کرتے تھے۔ ہم دور دراز ملکوں سے آئے ہیں..... سمندروں کے سینے چیر کر“

پہاڑوں کو پھلانگ کر، ہمارے جزیروں کے کبھی تیرے جہاز بھی گزرے ہوں گے۔ آج ہم  
خاندان برباد، ملک ملک پھر رہے ہیں۔ مگر تو ہمیشہ کی طرح شاد و آباد ہے۔ یہ کیا راز  
ہے!..... یہی جاننے کے لیے ہم تیرے یہاں آئے ہیں۔“

سندباد کے ہونٹوں پر خاموش مسکراہٹ پھیلی تھی۔  
مل گئے مٹیالے چہرے نے اسے دیر تک دیکھا ————— ”ہم بھول گئے تھے  
مسکراہٹ کسی ہوتی ہے.....“

سندباد کی مسکراہٹ سکڑنے لگی۔ اس کی پیشانی پر تردد کا بادل چھا گیا —————  
”کیا دنیا میں رنج و الم اس درجہ بڑھ گیا ہے!“

”تو صدیوں سے محل سرا کے خراب دور چھوڑ کر باہر نہیں گیا..... تو کیا  
جانے اس دنیا پر کیا کیا بیت گئی!“  
سندباد سوچ میں ڈوب گیا۔

”یا پیر و مرشد آپ نے بتایا نہیں یہ دائمی راحت کی زندگی آپ نے کسی پائی؟“  
”سفر“

سب نے سوالیہ نظروں سے دیکھا کوئی کچھ نہیں بولا۔

”سفر“ ————— سندباد نے دہرایا۔

چہرے چپ چاپ ایک دوسرے کو دیکھنے لگے۔

”عیرانی کی کیا بات ہے؟ سفر..... سفر نے ہی مجھے سب کچھ دیا۔ مال و

دولت، علم و تجربہ، عقل و دانش۔ میں نے سات سفر کیے تھے۔“

مل گئے، مٹیالے چہرے نے مودبانہ کہا ”آپ کے سفروں کا زمانہ بہت پیچھے رہ گیا  
ہے۔ آپ کا دل دکھانا مقصود نہیں۔ مگر ادھر عرصے سے آپ سفر پر نہیں نکلے۔ ورنہ  
جان جاتے.....“ بات ادھوری چھوڑ کر وہ رُک گیا۔

سندباد نے آہستہ سے پوچھا ”کیا جان جاتا؟“

چپٹی ناک والے سیاہ چہرے نے کہا ”اب جزیروں کے لوگ آپ کے جہازوں

کو خوش آمدید نہیں کہتے ..... آگ لگا دیتے ہیں اور آگ سے بھاگتے ہوئے لوگوں کو کانے دیو پکڑ پکڑ کر بھون کر کھا جاتے ہیں۔“

مرجھایا ہوا زرد چہرہ بڑی دیر بعد بولا ”محترم آقا ..... نیلے سمندروں کا پانی سیاہ پڑ چکا ہے۔ قزاقوں نے راستوں پر پہرے بٹھا دیے ہیں۔ بھٹکے ہوئے جہازوں کو انق پر سبز زمینیں دکھائی نہیں دیتیں ..... کوئی کبوتری بھی ریتوں کی شاخ نہیں لاتی — اور کہیں کوئی جہاز کسی دیران جزیرے کی سنگلاخ پٹاڑوں سے ٹکرا کر پاش پاش ہو جائے تو وہاں ریگتے ہوئے انسانی جسموں کے پتھر ملتے ہیں، جن سے نشے میں بسے ہوئے زہر سے موت کی بو آتی ہے ..... اب کون کس طرف سفر کو نکلے؟“

”کون راہ سمجھائے؟ .....“ مچھلی کی لاش بھی سیاہ پانی میں الٹی تیر رہی ہے!“

\_\_\_\_\_ مل گئے چہرے نے کہا

ریکا یک سب چپ ہو گئے۔ سندباد کے چہرے پر سخت تردد کے آثار تھے اس نے پوچھنا چاہا — ”تم نے ایسے کتنے سفر کیے ہیں جو .....؟“ مگر جلد ادھورا چھوڑ دیا۔

سوال ناک دلے نے کہا ”آقاؑ محترم، ہم مسلسل سفر میں ہی ہیں — جب سے ہوش سنبھالا ہے۔“

سندباد کے محل میں اب مکمل سکوت چھا گیا تھا — مطر باروں کے نغمے، دف اور نفیری کی آوازیں سب سرچکے تھے — سندباد نے پہلو بدل کر کچھ کہنا چاہا۔ مگر پھر چپ ہو رہا۔

”آج سفر ہمارا مقدر بن چکا ہے .....“ زرد چہرے نے جھریوں میں سے کہا ”کون شوق سے اپنا وطن چھوڑتا ہے۔ مجبوراً جانا پڑتا ہے ..... پر بردوں کی طرح آب و دانے کی تلاش میں —“

چپٹے سیاہ نام نے کہا ”یا پھر سنگینوں کی نوک پر۔ خوف زدہ لوگوں کے قافلے بھیڑ بکریوں کے ریوڑوں کی طرح ہانک دیے جاتے ہیں ..... سرحد پار، اجنبی زمینوں میں ..... جہاں نفرتیں اُگتی ہیں۔ دیس نکالا بہت بڑی سزا ہے سندباد۔“

سندباد پھر سوچ میں ڈوب گیا۔ وہ مطمئن نہیں ہوا تھا کہ سفر برکتوں کی بجائے اذیتوں کا وسیلہ بن گیا ہے! ————— ”میرے لئے سفر ہمیشہ برکت کا باعث رہا۔“

”وہ اس لیے برادر نامور کہ آپ ہر سفر کے بعد اپنے وطن لوٹتے رہے۔۔۔۔۔ اپنے گھر۔۔۔۔۔ اپنی چھت کے نیچے! شاخ پر گھونسل برقرار رہے تو پرندے کا وجود بکھرنے نہیں پاتا۔“ مل گجے مٹیالے چہرے نے کہا۔  
سندباد خاموش بیٹھا رہا۔

”اب کوئی ایک دفعہ گھر چھوڑ جائے تو پھر واپس نہیں آتا!“ تیکھے نقوش والے اُداس چہرے نے کہا ————— ”وہ لمحہ بڑا سفاک ہوتا ہے سندباد، جب کوئی گھر کی دہلیز چھلانگ جاتا ہے۔ زمین عورت کی طرح ایک دفعہ چھوٹ جائے تو پھر اجنبی ہو جاتی ہے۔ خدو خال بدل جاتے ہیں، مزاج بدل جاتے ہیں۔ وہ غیر ہو جاتی ہے۔۔۔۔۔ خواب صرف خواب ساتھ چلتے ہیں۔۔۔۔۔ فاصلوں کی دیواریں پھاندر۔۔۔۔۔ اذیت ناک خواب! بے دفائی کی سزا دینے کو۔“

تیکھے نقوش والے کی آواز دھیمی ہوتے ہوتے رک گئی ————— سب چپ چاپ اُسے تکتے رہے۔۔۔۔۔ آواز پھر ابھرنے لگی۔۔۔۔۔

”اور اب واپس جانے کی فرصت ملے گی تو۔۔۔۔۔ دیر ہو چکی ہوگی۔ کوئی پہچانے گا بھی نہیں!۔۔۔۔۔ نہ وہ درو دیوار، نہ گلیاں، نہ راستے، نہ شجر، نہ ان پر بیٹھے ہوئے پرندے۔۔۔۔۔ شاخیں ساکت ہو جائیں گی۔ نئے رک جائیں گے۔۔۔۔۔ کون اجنبی آگیا ہمارے بیچ!۔۔۔۔۔ سندباد، وہ خواب والی زمین پھر کبھی نہیں ملتی۔ نہ زمین، نہ محبوب۔۔۔۔۔“

”آدم بوروز ازل سے ہجرت میں ہیں۔۔۔۔۔ دوبارہ خلد میں پہنچ بھی جائیں تو کون جانے یہ جنت دہی ہوگی؟۔۔۔۔۔ وہ وہاں غیر تو نہیں ہو جائیں گے!“

”ایسا نہیں کہتے۔۔۔۔۔ یہ کفر کی باتیں ہیں۔ تو بہ کرد معزز مہمان۔۔۔۔۔ رب العزت معاف کر دیتا ہے۔“ سندباد کی آواز میں احترام کی لرزش تھی۔



اور پھر خاموشی میں سب لوگ سر نیوڑھلے بیٹھے رہے۔

”تو پھر رب العزت نے ہجر مسلسل اور جلا وطنی کی سزا ہمارے مقدر میں کیوں لکھ

دی ہے؟ ————— نبیوں کو بھی ہجرت کرنی پڑی تھی۔ مگر وہ اسی کا حکم تھا.... سز باد‘  
ہم تو نبی نہیں ہیں نہ خدا نے ہمیں اپنی زمینیں چھوڑنے کو کہا..... پھر بھی ہم آج  
خاتمہ بدوش دیس دیس پھر رہے ہیں، پناہ کی تلاش میں! کیا تو ہمارے لیے ایک اور  
سفر نہیں کر سکتا؟.... آٹھواں سفر؟“

سز باد جو سوچوں میں غرق تھا، چونک پڑا ————— ”کس لیے؟“

————— کہ تو کوئی نیا جزیرہ، نئی زمین تلاش کرے۔ جہاں زمینوں کے سایوں  
میں ہماری نسلوں کی جڑیں جمی رہیں؛ پھر کبھی کوئی انھیں اکھاڑ نہ سکے!.....  
سز باد۔ تو پھر ایک بار اپنا جہاز نکال، اور اجنبی پانیوں کا رُخ کر.... تو دنیا  
کا سب سے ماحر جہاز راں ہے۔ ہمیں اپنے جہاز میں لے چل —————

یک بارگی سز باد اٹھ کر کھڑا ہو گیا ”واللہ ————— اے عزیزو! میں ایسا ہی  
کردں گا۔ میں تمہارے لیے، تمہارے ساتھ آٹھواں سفر کردں گا۔ میں نے طے کر لیا تھا، اب  
کوئی سفر نہیں کردں گا۔ مگر اب میں اپنی قسم توڑتا ہوں۔ سفر مقدّر ہے تمہارا بھی، میرا بھی  
.... میں سیاہ پانیوں میں جہاز ڈال دوں گا۔ کون جانے کسی جزیرے پر ہمیں راستہ  
بتانے کے لیے کوئی منتظر کھڑا ہو!“



## ریزہ ریزہ مہک

تو لڑکیو، خدا تمہارا بھلا کرے، یہاں سے دور، بہت دور، سورج سے پورب میں، چاند سے پچھم میں، ستاروں کے نیچ، جو پرستان ہے وہاں کی ملکہ نے شہزادہ نیک بخت کو طلسمی آرسی دی کہ جا میرے بیٹے، تو ایں میں جس کسی لڑکی کی صورت دیکھے گا، اس کی بخت بھی دکھائی دے گی، بہت دیکھ بھال سے کام لینا، عورت ذات کو تو نہیں جانتا —

شہزادے نے وہ آرسی لی اور اڑن کھٹولے پراڑتا گیا، دیس دیس .... صحرا صحرا۔ ایک گل بدن، جسم جمال، رشک حور، فیروزہ پری پرستان سے نہا کر نکلی تھی اور بادل پر بیٹھی گیلے بال سکھا رہی تھی۔ بادل بھی نیساں کا، جو کبھی بجلی بن جگے، کبھی موتی برسائے، جو ہوا بھی تھا، روشنی بھی، اور فیروزہ پری کی آنکھوں میں نرگس اور گالوں میں گلاب ڈول رہے تھے۔ لاہی چھکاری کے پسرین اور آب رواں کی اوڑھنی میں آذری مرقع لگ رہی تھی۔ ناگہاں پچشم مضطر شہزادے پر جا پڑی، جو گوہر مقصود کی تلاش میں تھک کر نخلستان میں ایک کھجور کی ٹھنڈک میں سو رہا تھا۔ دیکھتے ہی ہزار جہان سے فریفتہ ہو گئی۔ سامری اسم پڑھ کر دم کیا، اور اسی عالم میں شہزادے کو پرستان لے گئی۔ سب کی نظروں سے بچا کر، سات پردوں کی اوٹ میں، اپنے سیلاب محل میں چھپا کر رکھا۔

بیدار ہوا تو شہزادہ نیک بخت اپنے صیاد کے حُسن بے شل کو دیکھ کر خود ہی ایسر ہو گیا۔ ہوش دحواس کے ساتھ آرسی بھی کھو بیٹھا۔ مگر ایک آدم زاد، دوسری پری زاد، ملن ہو تو کیسے! — عشق کے بھید نرالے۔

فیروزہ پری نے شہزادے کو صدیوں، قرون قید میں رکھا۔ رات و دن اس کے

جلوہ حسن پر خدا ہوتی 'آہ میں بھرتی' اور اپنے پری زاد ہونے پر کف انوس ملتی —  
 مگر ایک دن پری کا دل بیسج گیا۔ شہزادے کو سیما ب محل سے رہا کر کے مکمل آزادی  
 دے دی۔ کہ جا میرے دل و جان کے مالک، اپنی مرضی و مراد کی حسینہ دل نواز کو تلاش کر لے۔  
 کہ آدم زاد کے لئے سوا کی نسل ہی چاہیے۔  
 لڑکیاں بت بنی سن رہی تھیں، — 'مگر اس کی آرسی؟' ایک نے پوچھا۔ اور  
 دادی ماں نے غصے سے اسے دیکھا۔

'اے لڑکی۔ بیچ میں نہیں بولا کرتے۔ پری نے آرسی چھپا کر رکھی تھی۔ لاکر شہزادے  
 کو دے دی۔ اور ساتھ ہی بھوک پیاس کے لڈ بھی۔ کہ اجنبی وقت میں، اجنبی لوگوں میں کوئی مشکل نہ ہو۔  
 'تو پری کی قید میں شہزادے نے کتنے دن گزارے؟' ایک اور لڑکی پوچھ بیٹھی۔  
 بڑی بی نے سفید بنگلا سر کھجایا، اور سرچ کر بولیں — 'جب شہزادہ چلا تھا تو سلیمان پیمبر  
 کو ہڈ ہڈ نے اطلاع دی تھی۔ اور جب پری نے آدم زاد کو آزاد کیا تو اولاد آدم کے قدم چاند پر جا پہنچے  
 تھے — اتنا عرصہ گزارا شہزادے نے فیروزہ پری کے محل میں؛  
 'تو شہزادہ پھر بھی حوالا رہا؟' بھولی بھالی، معصوم صورت والی ایک کچی کلنی نے پوچھا۔  
 'ایسے ہئے — دیدوں کا بانی مر گیا ہے۔ پٹر پٹر پوچھے جا رہی ہیں! کہا نا کہ بیچ  
 میں ٹوکا مت کرو — ایسی بھی کیا بے عقلی کہ یہ بھی پتہ نہیں، پرستان میں عمر کا پہلے رکھا  
 رہتا ہے — جو جیسا ہے دیا ہی رہتا ہے؟' ساری بالیوں نے جھینپ کر  
 نظریں نیچی کر لیں۔

تو خدا کی کرنی یہ ہوئی کہ شہزادہ زمین پر اترا تو نقشہ ہی بدلا ہوا تھا۔ ہر چیز اجنبی تھی۔  
 ملک نئے، جنگل اور پہاڑ نئے۔ صحرا اور سمندر نئے۔ نئے نئے جزیرے نمودار ہو گئے تھے۔  
 شہزادہ نیک بخت، جہاں گرد بنا دینا کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک گھومتا پھرا۔  
 محو حیرت تھا کہ لوگوں کا اتنا ہجوم کہاں سے گیا، کہ سطح ارض پر پاؤں دھرنے کی جگہ باقی  
 نہیں رہی! ادھر سر بہ فلک عمارتیں نظروں کی دیوار بنی یوں کھڑی ہیں کہ گھٹن سے ہواؤں  
 نے چپ سادھ لی ہے۔

پہر دوں کو دیکھتا تو سوچ میں پڑ جاتا، ان ترشے ہوئے گیسوؤں اور چست لباسوں میں کسے روکے، اور کس کی سیرت دیکھے آرسی میں! — یہاں تو ہر چہرے پر بدحواسی اور بے زاری کھنڈی ہوئی ہے! جیسے خوف میں بھاگا جا رہا ہو۔

یہہ لوگوں کے ریلوڈ کہاں سے آئے ہیں؟ ..... کہاں جا رہے ہیں؟ .....  
 مہما، سفید از زرد، ہرزنگ کے ڈھانچے رنگ رہے تھے ..... ایک شہر سے دوسرے شہر، ایک سرحد سے دوسری سرحد۔ کس سے بات کرے کوئی!

جرات کر کے ایک ناری کے پاس پہنچا۔ صورت اس کی مونہنی تھی۔ آرسی میں سیرت دیکھی تو دنگ رہ گیا — سیرت کا پتہ ہی نہیں تھا۔ ابھی نہ بری!

’کیا تم سارے جذبات، سارے ارمان — اپنی فطرت کو کھو بیٹھی ہو؟‘  
 اس نے پوچھا۔ ابلا خالی خالی نظروں سے اسے تنکھنے لگی۔ جیسے دیکھ بھی وہی ہو، اور نہیں بھی۔  
 ’کیا میری بات تم سمجھ نہیں پا رہی؟‘ کہاں سے آئی ہو تم؟

’بہت دور‘ ادھر لوہرب کے دیس سے۔ اس کی ساتھی ایک اور سندی نے کہا —  
 ’نام بھی یاد نہیں رہا اب تو۔ ہم کب نکلے تھے۔ کیوں نکلے تھے ..... نہیں۔ نکالے گئے تھے۔ سنگینوں کی لوک پر۔ ہمیں کچھ یاد نہیں ہے ..... ہماری بھلا شاہ... ہمارے لباس ..... ہمارے نام تک یاد نہیں ہیں —‘ اس نے اپنا سر بانہوں میں ٹھام لیا۔  
 اس کے لئے جگہ جگہ سے پھٹے ہوئے تھے۔ پتہ بھٹہ بہت جلدی آگیا تھا — بانہوں کی مٹیالی زردی میں جگہ جگہ ننھے ننھے سوراخ جھانک رہے تھے، سوئیوں کے سے۔  
 اور پھر وہ بانہیں نیک بخت کی طرف پڑھیں — ’تم کہاں سے آئے ہو؟.....‘  
 چلو گے ہمارے ساتھ؟‘ اور نظریں شہزادے میں پیوست ہوئی جا رہی تھیں۔

’تو کیا وہ اکیلی تھیں؟..... ان کے ساتھ کوئی نہیں تھا؟‘ معصوم کلی نے پوچھا۔  
 ’وطن چھوڑنے کے بعد سب اکیلے رہ جاتے ہیں۔‘ جانے والے بھی، اور پیچھے رہ جانے والے بھی — بڑی بی کاسفید بگلا سرلوں ہلا جیسے ہوا میں کپاس کا ڈوڈا، معصوم کلی سہم کر چپ ہو گئی۔

شہزادہ نیک بخت بوکھلا گیا۔ پیچھا پھڑا کر ایک بڑے اونچے، انسانوں کے ڈر بے میں گھس گیا۔ بجلی کے جھولے میں چڑھ کر جانے کون سی اونچائی کے کایک میں جا پہنچا۔ بڑے قیمتی فرنیچر سے سجا سجا یا کایک تھا۔ ایک اکیلا بوڑھا، چھوٹے سے پردے پر چلتی پھرتی بات کرتی ہوئی رنگین تصویریں دیکھ رہا تھا۔

ہر طرف موت کی باس پھیلی تھی۔

شہزادے کو دیکھ کر بوڑھا چیخا — کون ہو تم؟ کیوں آئے ہو؟ — خط لائے ہو؟

خط —! اور اس کے ساتھ ہی جانے کہاں سے ایک بڑھیا کایک میں بڑی خاموشی سے نمودار ہو گئی۔ جیسے روٹی کا گالا ہوا میں اڑتا ہوا آجائے — روٹی کو دیکھنے آئے ہو؟

روٹی! — اور شہزادہ بھاگ نکلا۔ وہ پاگل ہو جانا نہیں چاہتا تھا۔ مگر بھاگ کر جائے گا کہاں! — اس کی بادشاہت کو ختم ہوئے تو سینکڑوں ہزاروں برس بیت چکے تھے۔ پہلی دالی لڑکی نے دادی ماں سے پرچھا۔

کہیں بھی نہیں — بڑی بی بولیں۔ وہ جانا کہاں؟ —

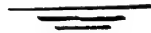
اب وہ گاؤں گاؤں، جنگلی جنگل پھرتا گیا۔ حذل، ساگوان، مہوہ اور لبان کی الہتر خوشبوؤں نے اسے پھر سے زندگی میں جھلایا۔ دن مست کی کنواری سگند نے ارمان جگائے۔ سر بلند پہاڑیوں نے حوصلے بلند کئے۔ سرسبز دایوں میں ہریلوں کی پہہکار نے اسے خوش آمدید کہا۔ کہیں کوہ سار کے ایک بادل نے سرگوشی کی — کہیں نیستان میں کسی گیت کے سروں نے اس کے قدم لئے، جو پہاڑی سے اترنے والے چشمے کے کنارے کوئی اہیر بنسی میں، بجارہ ہوتا —

آبشاروں کی پھواریں گوریاں بھی ملیں، جو کالے کالے، لابنے لابنے کیس شانوں پر کھولے، ہنسی گاتی، اشنان کر رہی تھیں۔ لگتا چاندنی راتیں نہاتی ہوں۔

چشم آہو، نگاہیں ہری دوب، پلکیں پیاد کی ٹھنڈک۔

شہزادہ سوچ میں پڑ جا — آرسی میں دیکھتا تو صورت کے سوا کچھ نظر

نہہ آتا — سیرت کا پتہ ہی نہیں تھا! — نہہ اچھا، نہہ برا! —  
 ایسا کیوں ہے؟ — وہ رہا نسا ہو کر سوچ میں ڈوبا آگے بڑھ جاتا —  
 اور آن کی آن میں لگتا، لودہ سورج چھپا، وہ دن ڈوبا، ..... وہ اک قدم میں رات آگئی!  
 اور لڑکیاں جو سر نیوڑھائے بیٹھی تھیں، اداسی کی رات میں اترنے لگیں۔  
 — اور پھر ایک دن شہزادہ پھوٹ بہا۔ آنسوؤں کا سیل رکتا ہی نہہ تھا۔  
 ہچکیاں بندھ گئیں۔ تب فیروزہ پری نے آن کر کہا —  
 میرے دلبر، میری جان، یہہ سیرت کس کے ہاتھ آئی ہے! ..... یہہ تو تریا چتر  
 ہے، — کبھی آن ہے، کبھی موم۔ آدم کو اذن سفر سیرت کی وجہ سے ہی ملا تھا۔ وہ روز ازل  
 سے سفر میں ہے۔ زاد سفر میں اب صرف صورت لئے پھرتا ہے، ..... ملک ملک، سرحد  
 سرحد۔ سیرت اتار پھینکی ہے۔ تو بھی آرسی پھینک دے۔  
 ▲▲  
 ( دزیر حسن کی چاند بی بی سلطان پڑھ کر )



## خوابوں کے پل

گہرے گہر میں طوفانی سمند کی لہریں چٹانوں پر پاش پاش ہو کر پھوار کی دبیز جھاد بھلا دیتیں اور مٹیالے بادلوں کا سرمہ اس چادر میں دھواں دھواں ہو جاتا۔

ریلنگ پر بیٹھے ہوئے آدمی کے ہیولے کو کبھی یہ دھواں نگل لیتا اور کبھی اگل دیتا۔ اسے کبھی اس آدمی کا چہرہ دیکھنے کا موقع نہیں ملا تھا۔ وہ ریلنگ پر ہمیشہ ایسے بیٹھا کر نیچے چٹانوں پر سر پٹکنے والی لہروں کا شور سنتا رہے اور ان سے بکھرنے والے موتیوں کو تکتا رہے۔ سڑک کی طرف اس کی پیٹھ ہوتی۔ دونوں سیر دریائی ڈنڈے پر ہوتے۔ ددر سے اس کے کوٹ کا رنگ کبھی سمجھ میں نہیں آیا۔ مل گجا سا بھرے رنگ کا لگتا تھا۔ نئے سر، مگر کوٹ کا کالر اندر کی طرف موڑے رکھتا۔

شمال مغربی انگلستان کی بری فی ہواؤں میں وہ اس ددر افتادہ طوفانی ساحل کے کنارے گھنٹوں بیٹھا کیا کرتا رہتا تھا۔ ————— کچھ ہی دور پہنچ کر بیٹھا ہوا آدمی اسے دیکھ کر سوچتا رہتا۔ کبھی ایسا بھی ہوتا کہ کئی دن وہاں کوئی نہ آتا۔

وایسے اس ویران، آسیب زدہ سے مقام پر آتا ہی کون تھا۔ ————— مغربی اسکاٹ لینڈ کے پتھریلے ساحل کی طرف جانے والی یہ سڑک یہاں ایک موڑ پر سمندر کے کنارے کنارے دور تک چلی گئی تھی۔ ایک پہاڑی پر نہ جلنے کس زمانے کا بنا ہوا ایک تلخہ تھا اور اس کی ڈھلان پر ساحل تک چند گھرا دھرا دھر بکھرے ہوئے تھے۔

شام کا اندھیرا بطرحہ جاتا تو کہیں سے ایک عورت کا سایہ سا نمودار ہوتا، دھند میں لپٹا ہوا سا، اور جا کر ریلنگ کے قریب کھڑا ہو جاتا ————— اور پھر وہ دونوں چلتے ہوئے

گہرا لود اندھیرے میں غائب ہو جاتے۔ بینچ والے آدمی نے انہیں باتیں کرتے ہوئے کبھی نہیں سنا۔ مگر اس دن شام کا اندھیرا بڑھتا گیا اور عورت کا سایہ نمودار نہیں ہوا، اور جب سرد مرطوب اندھیرا سمندر کی ہوکرات میں جذب ہونے لگا تو بینچ والا آدمی اٹھ کر ریلنگ کے پاس چلا گیا۔ ریلنگ پر سے اٹھ کر وہ چپ چاپ اس کے ساتھ یوں چلنے لگا جیسے سدھتا ہوا بچہ۔

”تمہاری بیوی نہیں آئیں آج؟“

تب اسے پتہ چلا کہ وہ بیوی کے ساتھ نہیں جا رہا ہے۔ ”بخار بڑھ گیا ہو گا۔“ اور پہلی بار بینچ والے آدمی نے اس کا چہرہ دیکھا۔ گندمی رنگ کے ہندوستانی چہرے پر مرطوب ہوا کے تین چار قطرے لرز رہے تھے۔

”تمہارا گھر کون سا ہے؟“

”گھر۔۔۔۔۔؟ آواز کی لہریں سانسوں میں الجھ کر رہ گئیں۔ وہ نیچے دیکھ کر چل رہا تھا۔۔۔۔۔“ بہت دور ہے، جن کے کنارے۔۔۔۔۔“

بینچ والے آدمی کی سمجھ میں کچھ نہیں آیا۔ اس کا گھر آگیا تھا۔ وہ اسے اندر لے گیا۔ وہ اسی فرماں برداری کے ساتھ چلا آیا۔ جیسے اس کے لیے اس گھر میں اور اپنے گھر میں کوئی فرق نہ ہو۔ یہ ایک چھوٹا سا کٹیج تھا۔ آتش دان کے سامنے دونوں بیٹھ گئے۔ ان کے چہروں پر شعلوں کے عکس لڑاں تھے۔

اور تب بینچ والے آدمی نے دیکھا کہ اس کے مقابل کا چہرہ کتنا ادا ہے۔۔۔۔۔ ویران کھنڈر۔۔۔۔۔ ویسا ہی خاموشی۔

اسی خاموشی میں اس نے ایک ہی گھونٹ میں دھسکی کا سا پیگ خالی کر دیا۔ کوٹ کی آستین سے ہرنٹ پڑھتے ہوئے وہ کچھ کہتے کہتے رک گیا۔ شاید اسے خاموشی ہی پسند تھی۔

کاٹیج والے آدمی نے دوسرا پیگ دیا۔ اس نے اسے بھی اسی تیزی سے خالی کر دیا۔ آتش دان میں کوئی کڑی کا ٹکڑا زور سے پٹھا اور چنگاریاں اڑتی ہوئی دور تک چلی آئیں۔ وہ انہیں بچے کی طرح دیر تک دلچسپی سے دیکھتا رہا۔۔۔۔۔ اس وقت اس کا چہرہ کتنا معصوم لگ رہا تھا۔



”میں تمہارے گھر اطلاع کرادوں — کہ تم —“ اور وہ رک گیا۔  
 ”مجھے کیا ہوا ہے؟“ معصوم چہرے نے پوچھا۔  
 ”تمہاری بیوی بیمار ہے۔“

”ہاں —“ لوسی بیمار ہے“ رکتے رکتے ایسے کہا جیسے بھول گیا تھا۔  
 ذرا سے پس و پیش کے بعد وہ اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ لڑکھڑاتے قدموں سے دروازے کی طرف  
 جاتے ہوئے خود سے باتیں کیے جا رہا تھا — مجھے جانتا ہے۔ لوسی بیمار ہے — مگر وہ  
 ٹھیک ہو جائے گی۔ اسے کچھ نہیں ہو گا — وہ مرے گی نہیں۔ کہیں اپنے گھر میں ہی کوئی  
 مریا ہے؟

یہ کیا ایک وہ پلٹ کر دروازے کے پاس کھڑا ہو گیا۔  
 ”اپنا گھر ماں کی گود ہوتا ہے — جہاں زندگی ملتی ہے۔ اسے چھوڑ کر  
 میں کب سے اپنی لاش اٹھائے پھر رہا ہوں۔ مگر تمہیں یہ سب کیا معلوم — تمہیں کچھ بھی  
 نہیں معلوم —“

عجیب بے بسی اور پس و پیش کے عالم میں وہ دروازے کے پاس کھڑا تھا — ”کیسی  
 عجیب بات ہے — برسوں کے بعد آج میرا جی پیادہ رہا ہے کہ باتیں کروں — اپنی  
 باتیں —“ اور ہولے ہولے واپس آکر آتش دان والی کرسی پر بیٹھ گیا۔  
 ”یہ مت سمجھنا اس کی وجہ تم ہو۔ اس کی وجہ یہ آتش دان ہے، اس میں چٹختی ہوئی چنگاریاں  
 ہیں۔ انہوں نے مجھے اس گود میں پہنچا دیا جہاں میرا جنم ہوا تھا — اونچے اونچے دالان،  
 خرابیاں — آتش دان والا پکا کوٹھا — پتویارے سے بھنا صاف دکھائی  
 دیتی تھی۔“

اور پھر وہ کچھ دیر خاموش بیٹھا آتش دان کو دیکھتا رہا۔ پہنچ والے آدمی نے بھی کوئی  
 بات نہیں کی۔

”کتنا بھرا پڑا تھا وہ گھر — بڑا ہونے پر بھی چھوٹا لگتا تھا۔ صحن میں آم اور  
 حلاسن کے درختوں کے نیچے پچھل کا ہلڑا چھا رہا تھا، اور شام کو ان کی شاخوں پر چڑیاں جمع ہو کر

شورچا تیں \_\_\_\_\_ اور پھر ایک دن وہ سب وہیں چھوڑ کر میں چلا آیا، بتیس برس ہو گئے۔  
اس چوکھٹ کو پھر کبھی دوبارہ نہیں پھلانگ سکا۔“

بیخ والے آدمی نے کچھ پوچھنا چاہا، مگر ہاتھ کے اشارے سے کوٹ والے نے چپ کر دیا۔  
”تم انگلستان میں رہ کر کیا جانو، ان دنوں ہمارے دیس میں کیا اُتھل پتھل ہو رہی  
تھی۔ ایک تاریخ مٹ رہی تھی۔ ایک بن رہی تھی۔ ہر طرف انرا فیری تھی، مستقبل  
غیر یقینی لگ رہا تھا۔ لوگ اپنے گھر چھوڑ چھوڑ کر ہر سمت بکھرے جا رہے تھے۔ میں بھی بکھر گیا  
ایسا کہ \_\_\_\_\_ پھر آج تک نہ جڑ سکا! \_\_\_\_\_ یہ جو تم دیکھ رہے ہو، میرا دوسرا قالب  
ہے۔ اس میں اور میرے پچھلے وجود کے ٹکڑوں کے درمیان \_\_\_\_\_ بس ایک واسطہ لگا  
\_\_\_\_\_ خوابوں کا \_\_\_\_\_ خوابوں کے پل پر سے گزرنے کی یہ ٹکڑے رات کی تاریکی میں  
ایک ایک کر کے آجے ہو رہے ہیں اور میرا وجود کھل اٹھا ہے، جیسے فاختہ زمین کی خوشخبری لے  
آئی ہو \_\_\_\_\_

مگر پھر صبح کو اس وجود کا انگ انگ بکھر جاتا ہے \_\_\_\_\_ صرف دوسرا قالب  
رہ جاتا ہے، اور اس کے رگ دپلے میں خواب کے چھوڑے ہوئے کرب کا نشتر! \_\_\_\_\_ ہر خواب  
ایک نائٹ میئر کی طرح جمع ہو جاتا ہے۔ خوابوں کا یہ سلسلہ میرا مقرر بن چکا ہے \_\_\_\_\_ اور  
میں ویلنگ پرسہا بیٹھا رہتا ہوں \_\_\_\_\_ اگلے نائٹ میئر کے خون میں \_\_\_\_\_  
مسل لڑنے سے اس کا سانس پھول گیا تھا۔ جانے کتنے دن کا لاوا پھٹ پڑا تھا۔ \_\_\_\_\_

دوسرا آدمی سوچ رہا تھا کیا اس کی بیوی یہ سہہ جانتی ہے! \_\_\_\_\_  
”اب جان گئی ہے \_\_\_\_\_ وہ میرا دکھ سمجھنے لگی ہے“ جیسے دوسرے آدمی کے خیالات  
اس نے پڑھ لیے ہوں \_\_\_\_\_ ”سفید قوموں کے لیے بے وطنی ایک غیر اور اجنبی مسئلہ ہے۔ کیا  
تم \_\_\_\_\_ میری ٹریڈری جان سکتے ہو؟“

میزبان نے کوئی جواب نہیں دیا۔ اس کے پاس جواب تھا بھی نہیں \_\_\_\_\_ اور پھر  
بہت دیر تک ددڑن خاموش بیٹھ رہے \_\_\_\_\_ آتش دان میں شعلے اب دب چکے تھے۔  
ہلکی ہلکی تملازت ہر طرف پھیل گئی تھی۔ جس میں دیک کر خاموشی اور بھی تہمتا اٹھی \_\_\_\_\_

”تیس برس بہت ہوتے ہیں ———— اتنے دن تم کہاں رہے۔“

”لندن میں ———— لوسی کے ساتھ ———— ریٹائر ہونے تک“ ———— کوٹ والے

آدی کی آواز میں اب تناؤ نہیں تھا ———— خاوا امریکہ میں سیٹل ہو گیا ———— لیز اسٹریلیا میں  
ریسرچ کر رہی ہے۔ شاید سٹا دیاں بھی کر لی ہیں“ ———— اس نے خود ہی پہل کر کے میزبان  
کے پس دبیش کو ختم کر دیا۔ ———— اور پھر چند لمحوں کے لیے چپ ہو گیا۔

”بتاؤ۔ کون سے دیس جاؤں ———— تم پر چننا چاہتے تھے ان تیس برسوں  
میں کبھی اپنے دیس کیوں نہیں گیا؟ کس لیے جاتا؟ ان دروں اور محرابوں میں اب کون رہا ہوگا  
———— جھوٹے بڑے سب چلے گئے ———— بکھر گئے۔ کھو گئے۔ ———— ہجوموں میں،  
قافلوں میں ————“ اس کی آواز پھر کھردری ہونے لگی۔ تناؤ بڑھ رہا تھا۔

”آم اور جان کی سٹاخوں پر سر ہچانے والی ساری چڑیاں اڑ گئیں ———— موسم بدلتا  
ہے تو پرندے ہجرت کو جاتے ہیں مل کر اڑتے ہیں تو واپس بھی آتے ہیں۔ مگر ایک ایک کر کے  
اڑیں، الگ الگ ستروں میں، تو کوئی واپس نہیں آتا ———— کوئی واپس نہیں آیا ————  
سنا تھا، وہ حویلی بھی باقی نہیں رہی ———— اس دن اس کی جو کھٹ الاٹنگ کر میں نے  
بھیانک غلطی کی ———— بے دہائی کی۔“

اس کی آواز کپکپانے لگی تھی۔ ———— پنج والے آدمی نے اس کے گلاس میں تھوڑی سی دھسکی

اور ڈال دی۔

”ہمارا سارا خاندان بے نام و نشان ہو گیا۔ پشتوں سے چلا آ رہا تھا ———— وہ بہن بہن  
———— ہمارے طور طریق ہمارے کارنامے، ہمارے راز ———— ہمارے گھر لیونام، آٹافانا  
نیت، دناورد ہو گئے۔ تیس برس کوئی بڑا وقفہ نہیں ہوتا۔ مگر ہمارے لیے قیامت ڈھانگیا  
————“ اس کی آنکھوں میں صدیوں کی دیرانی تھی، اور آواز میں درد کا دریا۔

ہماری نسل کے بعد کون جانے گا، کون کہاں کا ردڑا ہے ———— اس کے  
آبا و اجداد کون تھے؟ ———— دادا کے نام بھی یاد نہیں رہیں گے ———— کہاں کا کلچر  
———— کون سا مذہب ———— زبانیں، نام اور لباس بھی بدل جائیں گے ————

بتاؤ، کون میرے خواب سننے گا ————— کون میرے گھاؤ دیکھے گا ————— کسے دل چسپی ہوگی؟  
 ————— میں کتاب کے آخری صفحے کا آخری جملہ ہوں

اس کی آنکھیں بند تھیں۔ ہلکی ہلکی تمازت میں اس کا گدھی چہرہ آتش دان کی طرح  
 دھپک رہا تھا اور وہ آنکھیں بند کیے اسی طرح بیٹھا رہا۔

یہ کایک دوسرے آدمی کے ذہن میں ایک خیال آیا ————— ”کیوں نہ تم ایک بار ان  
 خوابوں کی سرزمین میں ہو آؤ؟ تاکہ پھر وہ تمہارا پیچھا چھوڑ دیں ————— تم ان کی گرفت سے  
 آزاد ہو جاؤ۔“

اور پھر ایک لمبا دفعہ گزر گیا۔ بیچ والے آدمی کو ریلنگ پر وہ آدمی نظر نہیں آیا۔ وہ  
 بے چین رہنے لگا۔ کیا اس نے خوابوں کے پل پر سے واپس جانے کی ہمت کر لی۔

اور پھر ایک شام اس نے دیکھا کہ ریلنگ کے سہارے اس کی بیوی کا دھندلا سا یہ  
 کھڑا ہے، اسی جگہ ————— جہاں سے اس کا شہر نیچے گہرائیوں میں سمندر کی لہروں کو چٹانوں  
 پر سر ٹپکتے دیکھا رہتا تھا۔

”نہیں“ وہ ”اپس نہیں آیا“ اس کی بیوی نے بغیر پلٹے کہا ————— نہ ماں کی گود ملی  
 اور نہ شاید خوابوں سے آزادی —————

بیچ والا آدمی ریلنگ پر جھک کر کھڑا ہو گیا ————— ”مجھے پوری بات سننا سکو گی؟“

”ہے ہی کیا سنانے کو ————— سارا دلولہ سارا تباؤ ————— جاتے ہی ختم ہو گیا۔

مجھے یاد ہے جب جہا کے کنارے وہاں پہنچے تو اس کے ہاتھ کانپ رہے تھے۔ اس نے جھک کر دونوں

ہاتھوں میں تھوڑی سی مٹی اٹھالی ————— جیسے وہ بہت مقدس ہو ————— مگر دوسرے ہی

لحظے اس نے ہاتھوں کو جھٹک دیا ————— مٹی کی بجائے نکیلے کنکروں نے انہیں ڈس لیا تھا

————— اجنبی کنکروں نے ————— یا پھر شاید وہ خود ان کے لیے اجنبی تھا ————— ”چند

لمحوں کے لیے وہ رک گئی۔ پتہ نہیں کون سے دھند لکوں میں کھو گئی تھی۔

”ہاں ہر چیز اجنبی تھی۔ ہر گھر، ہر گلی ————— سنئے جہروں کے، بھوموں سے وہ

گھبرا اٹھا ————— یہ اس کے خوابوں کی سرزمین نہیں تھی ————— اجنبی ————— اجنبی —————

اسے ہر سمت سے آوازیں آرہی تھیں۔۔۔۔۔ یہ کون آگیا۔۔۔۔۔ اجنبی۔۔۔۔۔ اجنبی۔۔۔۔۔  
 اور وہ جہنا کی ریت پر تنہا کھڑا تھا۔۔۔۔۔ مجرم کی طرح۔۔۔۔۔ تب پہلو سے اس  
 نے ایک آواز سنی، بھاری گنجیلی آواز۔۔۔۔۔

مور کھجک کو صرف تین دشاؤں میں جاکر نہیں رکھا جاسکتا۔۔۔۔۔ ایک چوتھی  
 دشا بھی ہوتی ہے۔۔۔۔۔ سمے کی۔ اس ایکس پر بہتے ہوئے دھرتی بھی تنکے کی طرح بے بس  
 ہو جاتی ہے۔ انگ انگ اُدھڑ جاتا ہے۔ سمے کی تیز آندھی اس کے سینے پر سے ہر شان مٹا دیتی  
 ہے۔۔۔۔۔ نئے نشانوں کے لیے۔ چوتھی دشا بڑی ظالم ہے۔۔۔۔۔ تو کون سے نشان ڈھونڈ  
 رہا ہے؟

جہنا کی ریت پر بیٹھے ہوئے سادھو کی آوازیں ایسی اپنا نیت تھی کہ میرا شہر اس کی طرف  
 کھنچا چلا گیا۔ اس کی باتوں کی گہرائیوں میں ڈوبتا چلا گیا۔  
 اور وہ چپ چاپ سامنے سمندر میں بہت دور دیکھنے لگی۔۔۔۔۔ جہاں دونوں  
 تیلہٹیں مل جاتی ہیں۔ بڑی دیر بعد بولی۔

وہ دونوں کہیں شمال کی طرف چلے گئے۔ پتہ نہیں اسے خوابوں سے نجات ملی یا نہیں۔  
 شام کا دھند لکا پھیل گیا تھا، اور پہاڑی کی ڈھلان پر اکاد کا روشنیوں  
 جھلملانے لگی تھیں۔۔۔۔۔ ہر روز کی طرح۔۔۔۔۔

## دل زار

آج پھر زندن آیا تھا۔ کہنے لگا جا کر اپنا نام اد رپتہ، پھیلا اور موجودہ، لکھا آؤ۔ ورنہ وہ لوگ یہاں رہتے نہیں دیں گے۔ اس پر دیسی شہر میں جزیرے کے لوگ ردز آ رہے ہیں۔

اور وہ یہہ شہر چھوڑنا نہیں چاہتا تھا۔ اس لئے کہ یہیں سے ایک دن اسے واپس جانا ہے..... جزیرے کو۔ جہاں اس کا گاؤں ہے، اس کا وطن۔ شری رام بھی اس جزیرے پر بیڑھائی سے پہلے اس شہر میں نہیں رہے ہوں گے۔ کون جانے!

مگر واپس جانا ہے تو نام کیسے لکھوا سکتا ہے! ————— پھر جائے گا کیسے؟ وہ یہہ شہر چھوڑ کیسے سکتا ہے؟ ..... وہ یہیں تو رہتی ہے۔ اس کے ساتھ نہہی! مگر اسی لیے، جوڑے اور اُونچے اُٹھتے ہوئے شہر کی فضاؤں میں وہ بھی سانس لیتی ہے۔ اسے اس کا پتہ نہیں معلوم ————— کبھی بتایا بھی نہیں اس نے، اور نہہ شائد اس نے پوچھا کبھی! مگر ہر تھوڑے دن میں وہ اسے مل جاتی ہے..... کسی دکان سے نکلتی ہوئی..... کسی موٹر ٹیکسی کو بلاتی ہوئی۔ اور پھر وہ اس کے ساتھ ہو جاتی ہے۔ جزیرے سے وہ بھی اسی شہر بھاگ آئی تھی۔

اس شام وہ اکیلا کھڑا سمندر کی موجوں کو دیکھ رہا تھا۔ اسے پتہ بھی نہ چلا، کب پُچپ چاپا اس نے اپنی موٹر لاکر کھڑی کر دی، اور ہاتھ بڑھا کر اگلا دروازہ کھول دیا۔ وہ بیٹھ کر سنبھلا بھی نہیں تھا، کہ اس نے موٹر اسٹارٹ کر دی۔

”تمہاری نئی نظم بڑی پیاری ہے“

”تم نے کب پڑھی؟“

”بھول گئے؟ ————— تم ہی نے تو سنائی تھی۔“

”تو تمہیں یاد ہے؟!“

ہوا کے شریر بھونکنے نے تمہارے بال بکھیر دئے —  
 مگر تم باگیسری گاتی رہیں، آنکھیں بند کئے۔ اور یہ بھی نہیں دیکھا،  
 سفید بگلوں کی قطار، کالے بادلوں سے نکل کر نیچے دھرتی پر چلی آئی —  
 اور تم باگیسری گاتی رہیں، آنکھیں بند کئے۔ بال پھیلائے  
 اور یہ بھی نہیں دیکھا، وہ تمہاری ہر تان کی موجوں کے ساتھ اڑان بھرتے رہے  
 — ادھر، نیچے، آگے، پیچھے —  
 سمندر کی ہوا میں اس کے بال بکھر بکھر جا رہے تھے، اور وہ نظم سن رہی  
 تھی۔ آواز کی مٹھاس میں راگنی کا نشہ تھا۔

”تمہیں تو ایسے یاد ہے، جیسے تم نے ہی لکھی ہو!“  
 اور وہ ہنس پڑی۔ فضاء میں بھول بکھر گئے — بنفشی، قرمزی، کاسنی  
 اور گلابی۔ ”مگر نظمیں لکھنے سے پہلے تم جرنلزم پاس کر لو۔ ضروری ہے — سمجھ؟“  
 ایک دہی تھی جو کھٹ سے اسے گھسیٹ کر زندگی کی حقیقتوں کی پوکھٹ  
 پر لاٹھڑا کرتی — کبھی غصے سے، کبھی ناز سے، — کبھی مض کھل کھلا کر ہنستے ہوئے  
 اور کھل کھلا کر ہنستی بھی تو لگتا جیسے لمحہ بھر کے لئے ننھے ننھے نفرتی گنگھروں سے تھک کر رک گئے ہو  
 اور اس دن بھی اس کی ہنسی کے سروں کی مٹھاس ابھی ہواؤں میں باقی تھی کہ —  
 اس نے موٹر روک کر دروازہ کھول دیا۔

وہ ساحل پر اسی جگہ کھڑا تھا — اور اس کی موٹر جاچکی تھی۔  
 عجیب بات ہے۔ جزیرے میں جب بھی وہ ملتے تو وہ بلا جھجھک اس کے ساتھ  
 ہر جگہ پھرتی — سارے میں سڑکوں پر، سینا میں — مگر یہاں، اس شہر میں وہ  
 بس زرا دیر کے لئے ہی آتی ہے۔ دل کے ایک دروازے سے داخل ہوتی ہے، اور جھجھک کے طرح  
 دوسرے دروازے سے نکل جاتی ہے۔ اور وہ جب پور نکلتا، وہ جاچکی ہوتی ہے، .....  
 اسے اداس چھوڑ کر!

یہ ہوا اسی لئے وہ کب سے پھر رہا ہے!

دہاں ان کے وطن میں سب کو پتہ تھا وہ دونوں ہمیشہ ساتھ رہتے ہیں، جہنم جہنم کے ساتھی ..... کالج سے نکلتے ہی بڑے بوڑھے ان کے بندھنوں کی رسم بھی پوری کر دیں گے۔ اور جب شہر میں قتل و خون پھوٹ پڑا ————— دھماکے ہونے لگے، ہوا میں مشین گنوں کی ————— آواز اور بارود کی بوس گئی، کرنیولگ کیا اور ہاسٹلوں پر حملے ہونے لگے، تو شہر سے بھاگ کر وہ دونوں جنگل کے راستے جان بچا کر گاؤں واپس آ گئے۔ راستے میں کبھی وردی والوں سے چھینا پڑا، اور کبھی چھاپہ ماروں سے، ————— کیونکہ کہیں بھی یہ پتہ نہ چل سکا، کون کس کے لئے لٹ رہا ہے! ————— ان کا محافظ کون ہے؟ لنکائیں سمجھی یادیں گزرتی تھیں۔ انہیں گھنے جنگل کے پیڑوں تلے اندھیری جھاڑیوں اور ہیلوں کے جال سے گزرنا پڑا۔ کانٹوں اور خار دار جھاڑیوں نے جسم لہو لہان کر رکھے۔ کہیں دل دل ..... اور کہیں سر بہ نلک چڑیاں۔ اور پھر ہر روز کی بارش؛ جس میں بھیگ کر زمین پر پڑی ہوئی ٹہنیوں اور پتوں کا دبیز فرش بھجک اٹھتا؛ اور راتوں کو اس میں سرسراتے ہوئے سانپوں اور کیڑوں کی آوازیں جنگلی جانوروں کی آوازیں سے زیادہ ڈراؤنی لگتیں ————— مگر انہوں نے سارا فاصلہ طے کر ہی لیا۔ وطن پہنچ ہی گئے۔ کیونکہ اکٹھے تھے۔

مگر جب آگ رادن کے جزیرے میں ہر طرف پھیل گئی۔ اور مکان سے شعلے بلند ہونے لگے، تو سب لوگ بدحواسی میں ادھر ادھر بھاگنے لگے، جیسے بل سے نکل کر چوٹے۔ اور پھر ان پر گولیاں برسنے لگیں ————— تڑا تڑا۔ اور وہ دہیں ڈھیر ہوتے گئے۔

وہ کیلوں کے باغ میں حق تعالیٰ کھڑا یہ سب دیکھتا رہا۔ وہ بھی وہیں جا رہا تھا، اسی مکان میں۔ بس ذرا سا فاصلہ رہ گیا تھا، ————— وہ اس سے ملنے جا رہا تھا۔

اور پھر یک لخت وہ سہم گیا۔ سرد لہر اوپر سے نیچے تک کاٹتی گزر گئی! چیخنا چاہا، مگر آواز حلق سے نہ نکلی سکی۔ دھڑکتے دل اور لڑکھڑاتے قدموں سے ایک ”قدم چلا تھا، کہ کسی نے اسکی بائیں پکڑ لی۔

’کہاں جاتے ہو؟‘ ————— ’فول؟ دیکھتے نہیں؟‘ وہ نندن تھا۔

’مگر ..... مگر وہ .....‘



'اُسے بھول جاؤ' اب وہ نہیں رہی۔  
 'کیا ..... کیا ہوا اسے؟' اس نے کہنا چاہا۔ مگر آواز سہم کر رہ گئی.....  
 مکان کا ایک حصہ جل کر گر رہا تھا۔ بانسوں اور ٹیٹوں کے چٹختے کی آواز آرہی تھی۔  
 'پتہ نہیں ..... جل گئی یا ..... وہ لوگ لے گئے'  
 'نہیں' وہ سن سے رہ گیا۔ جیسے برف کی سل میں دھنستا جا رہا ہو  
 'مفلوج ذہن میں الفاظ منجھ ہو کر رہ گئے' نہیں۔ اسے کچھ نہیں ہو سکتا۔ وہ وہاں  
 سے نکل گئی ہوگی..... تم اس کے بھائی ہو، مگر اسے نہیں جانتے؟ .... بے وقوف؟  
 اور پھر نندن، پتہ نہیں کیسے اور کہاں کہاں اسے لئے لئے پھرا۔ وہ بغیر  
 کسی مزاحمت کے اس کے ساتھ پھرتا رہا؛ بچے کی طرح۔ اور پھر وہی اسے جزییرے سے  
 نکال لایا، جان پر کھیل کر۔  
 وہ آنا نہیں چاہتا تھا۔ اسے یقین تھا، وہ اسے وہیں کہیں تلاش کر لے گا۔  
 وہ بھی اسے تلاش کر رہی ہوگی۔  
 مگر اس شہر میں آکر اس کی تلاش اور بھی شدید ہو گئی۔ اسے احساس ہو چلا تھا  
 وہ بھی جزییرہ چھوڑ کر یہیں آگئی ہے۔  
 اور پھر ایک دن وہ مل بھی گئی!  
 سمندر کے کنارے، ایک معمولی سے ہوٹل میں بیٹھا چائے پی رہا تھا، کہ وہ  
 برابر کی کرسی پر آ بیٹھی۔ کپکپاتے ہونٹوں پر پراسرار مسکراہٹ تھی۔  
 "ہلو۔ آخر تم مل گئے!"  
 وہ چونک گیا۔ "تم کہاں تھیں اتنے دن؟ مجھے اتنا کیوں ستایا؟"  
 "میں نے تمہیں دیکھ لیا تھا۔ مگر پاس نہیں آئی۔ تمہاری سلامتی کے لئے"  
 "سلامتی! ..... یہاں، اس شہر میں؟"  
 "ہاں ..... کون جانے!"  
 اس نے اطمینان کا ایک لمبا سانس لیا۔ "ادہ۔ آخر تم مل گئیں۔"

\_\_\_\_\_ میں کتنا پریشان تھا ! ..... اور تمہارا بھائی نندن ..... کتنا بے وقوف ہے !  
 وہ کھل کھلا کر ہنس پڑی \_\_\_\_\_ ”بے وقوف !“

اور پھر ہر طرف وہی کاستی اور بنفشہ موجیں بکھر گئیں ..... بڑے عرصے بعد۔  
 اور جب وہ تحلیل ہونے لگیں تو اس نے اسی پر اسرار سکراہٹ کے ساتھ پوچھا \_\_\_\_\_ ”بتاؤ  
 اس دن وہاں تم دیر سے کیوں آئے؟“

”میں کیلوں کے باغ میں رک گیا تھا۔ اچھا بتاؤ، تم نے ان لوگوں کو دیکھا تھا؟  
 \_\_\_\_\_ ان کے پاس مشین گنیں تھیں، اور مشعلیں بھی۔ وہ کون لوگ تھے؟.....“

مگر جواب سے پہلے ہی وہ جا چکی تھی۔ چپ چاپ، جیسے آئی تھی۔ ان چند لمحوں  
 میں اسے خوشی بھی دے گئی، اور اس بھی کر گئی۔

اس دن نندن ملا تو اس نے پوچھا \_\_\_\_\_ ”نندن۔ اس دن جزیرے میں وہ  
 کون لوگ تھے؟..... مکان جلانے والے،..... گولیاں برسانے والے؟“

”بتہ نہیں چل سکا“

”کیا وہ دشمن تھے؟“

”بتہ نہیں۔“

”تو کیا پھر دوست تھے؟“

”کچھ بتہ نہیں..... اور پھر اب کرنا بھی کیا ہے معلوم کر کے؟“ نندن بولا

\_\_\_\_\_ ”وہ ہمارا وطن تھا!“ اس نے بہت آہستہ سے کہا۔

”فول ! وطن سے کیا ایسے بھاگنا پڑتا ہے؟“

”تو کیا \_\_\_\_\_ یہ ہے ہمارا وطن؟“

”نہیں معلوم \_\_\_\_\_“ نندن نظریں پھیر کر بولا۔

”بے وقوف \_\_\_\_\_ گدھے۔ تجھے کچھ بھی نہیں معلوم۔ تیری بہن اس شہر میں ہے“

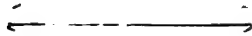
تجھے یہ بھی نہیں معلوم ! تجھے سوچ لینا چاہیے کہاں رہے گا اسے لے کر؟“

نندن چپ چاپ اسے دیکھ رہا تھا؛ اور اس کی نظریں اس میں پیوست ہوئی

جابر ہی تھیں ————— جیسے اس کے آپار دیکھ رہا ہو۔

اور پھر وہ اسے کئی دفعہ ملی۔ اسی طرح چند لمحوں کے لئے اس کی زندگی میں پھول  
کھلا دیتی، اور ان کے رنگوں کے سحر سے ابھی نکلنے بھی نہ پاتا کہ اسے پھر ادا اس چھوٹ جاتی۔  
کبھی کشتی میں بیٹھ کر سمندر کی گود میں در تک چلے جاتے۔ کبھی دور دراز ساحلوں  
کی ریت پر بیٹھ کر تاریل کا بانی پیتے۔ اور کبھی کسی شاندار ہوٹل کی لان پر شام کا وقت گزار دیتے۔  
کبھی نہان بن کر، اور کبھی میزبان بن کر؛ وہ اچھی طرح جانتی تھی، اسے کون سی چیزیں پسند ہیں۔  
اور پھر ایک دن یہ ہوا کہ جس بلڈنگ میں وہ اور اس کے ساتھی ٹھہرے ہوئے  
تھے، کچھ اجنبی لوگ مگس آئے۔ اور اندھا دھند گولیاں برسانے لگے۔ وہ بھی ان کی زد میں  
آگیا، بری طرح!

ہسپتال میں جب اسے ہوش آیا، تو نندن سرہانے بیٹھا ہوا تھا۔ ڈاکٹر اور نرسیں  
گم سم سے کھڑے اسے دیکھ رہے تھے۔ نندن نے اپنے بے رنگ چہرے پر ذرا سی سکرپٹ لاکر کہا  
”مالتی آئی تھی“ ————— تمہیں دیکھنے۔ ابھی ابھی گئی ہے۔“



## تہم در تہم

— نگاہِ روبرو، باادب، شہنشاہِ ہند تخت پر جلوہ افروز ہو رہے ہیں۔

امورِ سلطنت پیش ہوں، وزیرِ اعلیٰ۔

حضور۔ آج دربار میں ایک باغی سردار پیشِ خدمت ہے۔ اس نے عالمِ پناہ کی شان میں گستاخی کی ہے۔ علمِ بغاوت بلند کر کے شاہی جلال کو للکارا ہے۔ ارشاد ہو، اس غدار کو کیا سزا دی جائے؟

آپ کے خیال میں کون سی سزا مناسب ہوگی؟

غلام کی رائے میں، کڑی سے کڑی سزا اس کے جرم کی تلافی نہیں کر سکتی۔

ہم وزیرِ اعلیٰ کی رائے سے متفق ہیں۔ اور اس غدار کو عمر بھر کے لئے..... جلا وطنی کی سزا دیتے ہیں۔

گستاخی معاف حضور۔ یہ سزا تو بہت ہلکی ہے!

نہیں وزیرِ اعلیٰ۔ یہ بہت بڑی سزا ہے۔ قتل کی سزا سے بھی سخت۔

یہ کیسے ممکن ہے؟

مکن نہیں، حقیقت ہے..... لے جاؤ۔ اسے جلا وطن کر دو۔

غلام کی سمجھ میں نہیں آ رہا ہے، یہ کیسی حقیقت ہے!..... کیا حضور والا سمجھا سکیں گے؟

اور اس کے بعد کھیل رک گیا۔

یہ سوال مجھ ہو کر فضا میں معلق ہو گیا ————— یہ سزا سب سے سخت کیسے ہے ؟  
کوئی کچھ نہ بتا سکا۔

بادشاہ نے سر سے پگڑا اتار دیا۔ اور قیدی کی طرف دیکھنے لگا۔  
———— اب بتاتے کیوں نہیں ؟ 'تم نے ہی تو لکھے ہیں یہ ٹائیل گ ! ..... اب سمجھاؤ۔  
..... جفا وطنی سب سے بڑی سزا کیوں ہے ؟

میرے ابا نے ہی بتایا تھا۔  
مگر کیسے ؟ ..... یہ کیسے ہو سکتا ہے ؟  
چلو۔ چل کر پوچھتے ہیں۔  
ہاں ! بچو۔ یہی درست ہے۔ راجا اور بادشاہ اپنے خطرناک دشمنوں کو ملک بدر  
کر دیا کرتے تھے۔

قتل یا پھانسی کی سزا، کیوں نہیں دیتے تھے ؟  
خاموشی  
تم نے پڑھا نہیں، بھگوان رام کی سوتیلی ماں نے بھی انہیں چودہ برس کے بن باس کی  
سزا دی تھی ؟  
مگر وہ صرف چودہ برس کی جفا وطنی تھی۔ عمر بھر کی نہیں ..... ہمارے سوال کا  
جواب یہ نہیں ہے۔

پھر خاموشی  
ہر پل بوجھل ہوتی جانے والی خاموشی —————  
قیدی بچے کے ابا جواب نہیں دے سکے، اس لئے کہ انہیں بھی معلوم نہیں تھا۔  
انہوں نے بھی اپنے بڑوں سے سن رکھا تھا، اور بس۔ کیوں کبھی پوچھا نہیں تھا۔  
ابا سوچ میں پڑ گئے، گہری سوچ میں۔



ان کے چہرے کی جھریوں کی تہوں میں دیکھو تو نکلتا جیسے روز ازل سے اب تک کے سارا  
روز و اسرار ان میں پوشیدہ ہیں !

بچے کے ابا کو لگا جیسے اس کی آہٹ سے وہ بزرگ اپنی لمبی گہری نیند سے ابھی ابھی بیدار  
ہوئے ہیں ۔

مسکرائے ۔ اور بیٹھنے کو کہا تو لگا جیسے دیران اندھیروں میں اجالا کو ند گیا ۔ اور جیسے  
اس کچھما کی سنگلاخ چٹا زل نے آواز دم کو پہلی بار سنا ہو ۔ بیسیوں ابا بلیں پر پھر کھڑا اندھیروں  
سے باہر اڑ گئیں ۔

\_\_\_\_\_ ہاں ۔ یہہ سچ ہے ۔ جلا وطنی سب سے بڑی سزا ہے ۔ غربت میں آدمی ہر روز مرتل ہے  
ہر روز جیتا ہے ، ..... اگلے روز پھر جان کنی کے کرب سے گزرنے کو ۔

مگر حجب ایسا ہو کہ دیار غیر میں اُسے ساری آسائشیں میسر ہوں ؟  
تو بھی ۔ چھوٹے ہوئے وطن کے خوابوں کا غفریت اس کا تعاقب کرتا رہتا ہے .....  
... زندگی کے پیالے میں سے سارا رس چوس لینے کے لئے ۔

وطن کے باہر آدمی جتنا ضرور ہے ، مگر جینے کی خواہش کھودیتلے ۔  
اور مرنا کوئی نہیں چاہتا ۔

اس آگ میں انسان ہزاروں برس سے جل رہا ہے ..... تم میری بات اتنی  
جلدی نہیں سمجھو گے ۔ آؤ اب سو جاؤ ۔ کل صبح میرے ساتھ چلنا ہو گا ۔ دیکھو گے تو یقین آجائے گا ۔  
بچے کے ابا سو گئے ۔ اُس پہاڑ کے اُس غار میں جو ٹھنڈی ہوا سرسراہی تھی ، اُس کی تاثیر  
میں سحر تھا ، خواب آور ، ٹائم لوریوں جیسا !

نیند میں انہیں محسوس ہوا جیسے ان کا وجود ایتھر جیسی سیال شے میں تحلیل ہو گیا ہے ۔ اور  
کائنات کی پہنائیوں میں وقت کے محور پر پیچھے کی طرف بہتا جا رہا ہے !  
دراز ریش والے بزرگ نے انہیں سکایا ۔ اور دونوں روانہ ہو گئے ۔ کچھ ہی دیریں دونوں

ہمالہ کی بریلی پوٹوں کے تلے، شراستی، کپیل دستو، سارنا تھ اور دیشالی کے دیس میں پہنچ گئے۔  
وقت کا پیہر جہاں جا کر رکا تھا، وہ سدھارتھ کا زمانہ تھا۔ جب وہ مقدس سمبودھی کے  
بعد بدھا بن چکے تھے۔

لوگ زعفرانی چادریں لپیٹے، سر کے بال کٹوائے، جوت درجوت خانقا ہوں اور وہاں  
کو آباد کر رہے تھے۔ راہبانہ زندگی نے خواہشوں کا لبادہ اتار بھینکا تھا۔ گھر کے بندھنوں کو توڑ کر ان  
آزاد ہو چکا تھا۔

جنگل اور پہاڑ اس کے گیان دھیان کے استھان بن چکے تھے۔  
بچے کے باپ نے حیران ہو کر پوچھا — تو یہ راہب اپنے گھر، اپنے دیس چھوڑ کر  
کبھی کیسے ہیں؟ کیا انہوں نے دکھوں سے نجات پالی؟

ہاں۔ خواہشوں کو کچل کر —!..... سنو۔ آواز آرہی ہے :  
— دکھ اصل ہے، اور خوشی ایک پھسلتا ہوا سایہ، جس کے گزر جانے  
کا ڈر ہر دم لگا رہتا ہے۔ ہر خوشی اپنے پیچھے محرومی کا احساس چھوڑ جاتی ہے..... گویا دکھ کی جڑ  
ہے خوشی، خوشی کی پیاس۔

اور پھر بچے کے باپ نے دیکھا — بھگوان بدھانے اپنے سات جنموں کے بعد  
بہا پری نردان حاصل کر لیا ہے۔ اور ان کے ہنٹوں پر فتح کی سکرا ہٹ ہے !

مگر — بہا پری نردان پانے سے پہلے ایک بار وہ اپنے گھر گئے تھے.....  
..... اپنے دیس، اپنے وطن ! وہی جسے تیاگ دیا تھا ! اور یہی بات بتانے، بلکہ دکھانے  
کے لیے تمہیں یہاں لایا ہوں۔

دیکھو —

بھکشو کے لباس میں غل کے دروازے پر وہ جہاتا بدھ کھڑے ہیں۔ ہاتھ میں کاس  
ہے۔ رانی ان کے نو عمر لڑکے کو لے کر بھکشو کو دان دینے آئی ہیں۔ دروازے پر بھکشو اور رانی



کی نظریں مل رہی ہیں۔ پہچان کی چمک ابھرائی ہے۔

ہوا گن گنا رہی ہے ————— ” دیکھو ری اک بالا جو گئی دو ا رہا رہے آلو رہے۔“

اور پھر زمین کی جڑوں نے پاؤں جکڑ لئے۔ کئی دن تک وہ پاؤں محل کے درو دیوار چھوڑ کر باہر تہہ نکل سکے، جن میں ان کی جوانی اور بچپن کی خوشبوئیں رچی بسی تھیں۔

————— قیدی بچے کا باپ اس تصویر کے ہر نقش کو محویت کے عالم میں دیکھ رہا تھا، جو وقت کے سیل رواں میں ایک منجمد لمحے کی طرح اس کے سامنے اکی کھڑی تھی !

تم نے کبھی پھلے پھولے درخت کو اکھٹڑ کر نئی زمینوں میں لگانے کی کوشش کی ہے؟

————— باپ نے پلٹ کر دیکھا، لمبی ڈاڑھی والے بزرگ وہاں نہیں تھے۔

اس نے آسمان پر نظر کی۔ وہ واپس جا رہے تھے۔ مل گئے رنگ کے پہاڑ کی سمت۔ ۵۵

وقت کا بوجھ

پتھر یلی چپ

اونچے اونچے پہاڑ

میں پہاڑوں کے دامن میں پھیلی ہوئی گھاس پر  
پتی پتی کی تحریر پڑھتا ہوں اسرار میں غرق ہوں

( قاضی سلیم )

## انی

میں اس جگہ نیا نیا آیا تھا۔ بلڈنگ میں رہنے والے اکثر لوگوں سے واقف نہ ہو سکا تھا۔ یہ ایک اوسط درجے کی سہ منزلہ عمارت تھی اور میرا کمرہ اوپر کی منزل میں سرے پر واقع تھا دیکھ بھال اور مرمت باقاعدگی کے ساتھ نہ ہونے سے عمارت بوسیدہ ہو گئی تھی جگہ جگہ دیواروں پر سے پلستر چھڑ گیا تھا۔ پھر بھی یہ جگہ مجھے اس لئے پسند آئی کہ مٹی کی گنجان آبادی سے دور ناریل کے اونچے اونچے درختوں میں گھری ہوئی سمندر کے قریب واقع تھی۔ کرایہ بھی زیادہ نہیں تھا۔ دیسٹرن ریلوے کی لوکل بس منٹ میں چرچ گیٹ پہنچا دیتی تھی۔

بلڈنگ کی مالک ایک عورت تھی جسے سب لوگ میڈم کہہ کر پکارتے تھے۔ اس کا اصل نام مجھے معلوم نہ ہو سکا۔ شاید کوئی بھی نہیں جانتا تھا۔ اس کا فلیٹ میرے کمرے کے قریب ہی تھا۔ کرائے وغیرہ کے سلسلے میں دو ایک بار اس سے ملنے کا اتفاق ہو چکا تھا۔ چھوٹے سے قد کی کمزور جسم والی عورت تھی۔ سر کے بال سفید ہو چکے تھے۔ فراک پہنتی تھی۔ جس میں سے سوکھے سوکھے ہاتھ پیر لیں نکلے رہتے، جیسے کسی ٹھنڈے پر بچی ہوئی دو ایک ننگی شاخیں! کالوں کی ہڈیوں پر نکل کے فریم کی عینک ٹکی رہتی جس کے اندر سے دو مغرم آنکھیں بچھتے ہوئے چراغوں کی مانند ٹٹماتی رہتیں۔ اس کی بے رنگ آنکھوں کو غور سے دیکھنے پر محسوس ہوتا جیسے ان میں صدیوں کے غم اور دکھوں کی داستانیں جذب ہوں۔ بے پناہ غم کا یہی احساس اس کے چہرے پر بھریوں کے گہرے جال کو دیکھنے سے بھی ہوتا تھا۔ جیسے ان آنکھوں نے تمام عمر دکھوں کے دھارے بہا بہا کر چہرے کو سیراب

کیا ہو ..... اور اب جب کہ یہ دھارے اپنی تمام متاع لٹا کر سوکھ گئے تو یہ سرزمین بھی خشک ہو کر ترخ گئی اور بے شمار لکیروں کا جال چہرے پر چھوڑ گئی۔ میڈم کے نوکر جان نے مجھے بتایا تھا کہ میڈم کی تمام عمر غم جھیلنے اور دکھ سہتے گزری ہے۔ عرصہ ہوا جب اس کے شوہر کا انتقال ہو گیا ..... اس بلڈنگ کے سہارے اس نے اپنے اکلوتے بیٹے کو لکھایا بڑھایا۔ بڑا ہو کر وہ ایڈورس میں بھرتی ہو گیا۔ وہ ہوائی جہاز چلانے کی مشق حاصل کر رہا تھا اور جب اس کی اڑان کے صحنہ سات گھنٹے باقی رہ گئے تھے، وہ ایک حادثے کا شکار ہو گیا! اس غم نے میڈم کی رہی سہی ہمت بھی ختم کر دی۔ بیٹے کی تعلیم اور پوزیشن کی خاطر اس نے بلڈنگ رہن رکھوا دی تھی، اس امید پر کہ جب وہ پائلٹ انفرسٹن جائے گا تو بلڈنگ بھی چھوٹ جائے گی۔ لیکن یہ خواب پورا نہ ہو سکا اور اب ہر مہینے بلڈنگ کی آمدنی کا بڑا حصہ بگھڑائی سیٹھ کی جیب میں چلا جاتا ہے۔ نہ جانے کس دن آکر وہ اس پر پورا قبضہ جمالے! ..... میڈم کی داستان سن کر مجھے اس سے ہمدردی ہو گئی تھی۔

میڈم کا کمرہ پرانی دضغ کے بیش قیمت لیکن بوسیدہ فرنیچر سے آراستہ تھا۔ دیوار پر اس کے شہر کی تصویر لٹک رہی تھی اور ایک طرف نیشنل بیس پر ایک خوش رونو جوان کی تصویر رکھی تھی ..... کوئی بیس بائیس کی عمر مگر اتنا ہوا چہرہ ہنزون پر باریک مونچھوں کی لکیر۔ یہ اس کا بد نصیب بیٹا ہو گا۔ میں نے سوچا تھا۔ اس ملاقات میں میڈم سے اس کے بارے میں پوچھنے کی ہمت نہ ہو سکی وہ مجھ سے بڑی شفقت اور خلوص سے ملی۔ میرے بارے میں بہت سے سوالات پوچھے۔ کبھی کبھی مسکرا اٹھتی تو چہرے پر چھایا ہوا حزن اور نمایاں ہو جاتا .....۔

”جب کبھی کمرے میں اکیلے پڑے پڑے اکٹا جاؤ تو یہاں آ جانا۔ تم سے باتوں میں میرا بھی جی بہل جائے گا .....۔“ جاتے وقت اس نے مجھ سے کہا تھا۔

اس دن آسمان پر صبح سے بادل چھا رہے تھے۔ تھوڑی تھوڑی دیر سے بارش بھی ہونے لگتی۔ ہمکنی ہوئی ہوا کے بو جھل بھونکے اپنے ساتھ نمی اور خنکی کمرے کے اندر تک لے آئے تھے۔ میں ناشتے کے بعد خلاف معمول کمرے میں ہی تھا۔ موسم ایسا

غیر یقینی ساہو رہا تھا کہ باہر نکلنے کی ہمت ہی نہ ہوئی۔ ویسے اس دن کوئی خاص مصروفیت بھی نہیں تھی۔ آرام کرسی پر دراز میں کھڑکی میں سے باہر دیکھنے لگا۔ ہلکے نیلگوں کبر میں لپٹا ہوا سارا شہر عجیب پر اسرار سا لگ رہا تھا۔ ددر تک شہر کی بلند عمارتوں کا رانوں کی چھتوں اور گھنٹہ گھروں کے نقش و صند کے غلافوں میں لپٹے مدھم مدھم سے نظر آرہے تھے۔ نیچے سڑک بھی خالی خالی پڑی تھی۔ کبھی کوئی تیز رفتار موٹر گزر جاتی تو بھیگی ہوئی سڑک پر سیٹی کی آواز دور تک اس کے تعاقب میں ددڑتی جاتی اور کچھ دیر کے لئے خاموشی اور جہود کا احساس ٹوٹ جاتا۔

میں سوچنے لگا دن کیسے گزرے گا۔ دن بھر کھڑکی میں سے باہر کا نظارہ کرتے تو نہیں گزر سکتا!..... اور ٹھیک اسی وقت کسی نے دروازہ کھٹکھٹایا۔ جا کر دیکھا تو میڈم کا نوکر جان کھڑا تھا۔

”آپ کہیں باہر جا رہے ہیں؟“ اس نے پوچھا۔

”نہیں..... کیوں؟“ میں نے جواب دیا۔

”آپ..... برج کھیلنا جانتے ہیں؟“ اس نے پھر پوچھا۔

”ہاں۔ لیکن تم یہ کیوں پوچھ رہے ہو؟“ شاید میرا الجھ تلخ ہو گیا تھا جان نے

فوراََ معذرت چاہتے ہوئے جواب دیا۔ ”معاف فرمائیے..... میڈم نے کہا ہے

اگر آپ مصروف نہ ہوں تو کچھ دیر برج کھیلنے تشریف لائیے۔“

”برج کھیلنے؟!۔۔۔۔۔۔“ میرے منہ سے نکلا۔ میڈم کی تاش سے دلچسپی

کچھ عجیب معلوم ہوئی..... ”اچھی بات ہے میں ابھی آتا ہوں۔ میں نے جان سے

کہا۔ میڈم کی بات ماننا اچھا معلوم نہیں ہوا۔ اور پھر اسی لمحے میرے ذہن میں ایک اور

خیال آیا..... باقی دو پارٹس کون ہیں؟ میں اور میڈم اکیلے تو برج نہیں کھیل سکتے!

..... چنانچہ جان کو روک کر پوچھ ہی لیا کہ کون کون آرہے ہیں؟

”اور کوئی نہیں آ رہا۔“ اس نے جواب دیا۔ ”جو تھا پارٹس میں بن جادل گا۔“

باقی آپ میڈم اور امینی موجود ہی ہیں۔“ مجھے نہیں معلوم تھا کہ ضرورت پڑنے پر جان

پو تھا پارٹنر بن سکتا ہے !

”ایمنی کون ؟“ میں نے چونک کر پوچھا۔ یہ نام میرے لئے نیا تھا۔

”آپ نہیں جانتے ؟“ اس نے حیرت سے کہا۔ ”..... ادہ ایشا یہ

آپ ان سے ملے نہیں ہیں۔ ایمنی میڈم کی بہو ہیں۔“

”میڈم کی بہو !“ میں نہیں جانتا تھا کہ میڈم کی بہو بھی ہے میں نے تو سب

سے ہی سنا تھا کہ مائیکل کی شادی نہیں ہوئی تھی۔ یوں بھی اتنی کم عمر میں کون شادی

کرتا ہے ! ..... جان کے جلنے کے بعد میں ایمنی کے بارے میں سوچتا رہا۔

اور جب ایمنی کو دیکھا تو یاد آیا کہ اسے اس سے پہلے بھی دو تین بار دیکھ چکا

ہوں۔ اس بلڈنگ میں سیٹریسیوں پر آتے جاتے ..... یا شاید نیچے فٹ پاتھ

پر۔ اس وقت میں سمجھا تھا کہ وہ بھی اسی بلڈنگ میں کہیں رہتی ہوگی۔ وہ کپڑے

بڑے سلیقے سے پہنتی تھی ان کے لحاظ سے اپنے کٹے ہوئے بالوں کو بڑی خوبی سے سجاتی

..... شائد ہی وجہ تھی تو میں اُسے یاد رکھ سکا۔ درزیوں وہ ایسی غیر معمولی حسین نہیں

تھی۔ بس متناسب جسم اور گولہ اندھ وصال کی وہ ایک اینگلو انڈین لڑکی تھی۔ کھلتا ہوا رنگ

عمر کوئی پچیس برس ..... اس دن اس نے پیاز کی رنگ کا ایک خوبصورت

فراک پہن رکھا تھا۔

میں جب میڈم کے یہاں پہنچا تو وہ دونوں ایک صوفے پر بیٹھی تھیں۔ میڈم

کے سامنے دوسرخ ادنی گولے پڑے تھے۔ ہاتھ میں سلامیاں گھوم رہی تھیں۔ ایمنی ایک

کاپی پر جمی ہوئی پنسل سے کچھ لکھتی جا رہی تھی۔ مجھے دیکھتے ہی میڈم بولی ..... ”چلو ایمنی

رکھ دو ..... اب یہ گھر کا حساب کتاب بعد میں کرنا۔ ان سے ملو ..... یہ ہیں رشید

اور یہ ہے ایمنی میری بچی۔“ نکل کے فریم میں جڑے ہوئے عینک کے مدھم شیشے ایک

لمحے کے لئے چمک اٹھے۔ !

”میری بچی“ میڈم نے بڑے پیار سے کہا تھا۔ جیسے کوئی سچ مح کی ماں

اپنی بچی کے لئے کہہ سکتی ہے۔ ایمنی نے مسکراتے ہوئے کاغذ قلم ایک طرف رکھ دیا اور

مصافحہ کے لئے ہاتھ بڑھادیا۔ میں نے محسوس کیا کہ مکرانے وقت اس کا چہرہ بڑا دلادیز ہو جاتا ہے۔ جیسے مکرانے کی ہستی کا ایک بڑا ضروری جزو ہے! تعارف کے بعد تھوڑی دیر موسم اور بارش کا ذکر ہوتا رہا۔ اس دوران میں جان نے میز پر تاش جھانکے۔ اور پھر برج شروع ہو گیا۔ جان بھی شریک رہا۔ وہ اچھا خاصا گھلاڑی تھا بلکہ شاید ہم میں وہی بہتر تھا۔ میڈم بڑے انہماک اور دلچسپی سے کھیل رہی تھی۔ اس کی حرکتوں سے بچوں کا اس شوق ظاہر ہو رہا تھا۔ زیادہ تر وہی میری پارٹنر رہی۔ چوتھے یا پانچویں ربر کے بعد اپنی جان کو ساتھ لے کر چائے کا انتظام کرنے اندر چلی گئی۔ وہ میڈم کے گھر میں جس بے تکلفی سے مگھوم پھر رہی تھی اسے دیکھ کر میں میڈم سے پوچھے بغیر نہ رہ سکا کہ کیا وہ انہی کے ساتھ رہتی ہے؟

”نہیں۔۔۔۔۔“ میڈم نے جواب دیا۔ ”وہ سینٹرل ہاسٹل میں رہتی ہے۔“  
 ”سینٹرل ہاسٹل!“

”ہاں۔ وہاں وہ نرس ہے۔۔۔۔۔ اس کا کوارٹر ہاسٹل کے احاطے میں ہی ہے۔ فرصت ہوتی ہے تو یہاں آ جاتی ہے۔“

اپنی کے بارے میں میری دلچسپی بڑھتی جا رہی تھی۔ میں سوچنے لگا کیا واقعی میڈم کی بہو ہے! کچھ دیر رک کر میں نے پوچھا۔ ”وہاں ہاسٹل میں کیا وہ اکیلی رہتی ہے؟“  
 ”..... میرا مطلب ہے اس کے ماں باپ.....؟“

”نہیں اکیلی رہتی ہے۔“ میڈم نے بات کاٹ کر جواب دیا۔ ”..... میرے سوا اب اس کا بے بھی کون؟!“

اس کے بعد پھر چند منٹ خاموشی رہی۔ آخر ہمت کر کے میں نے پوچھ ہی لیا۔ ”..... میڈم کیا اپنی آپ کی بہو ہے؟“

میڈم نے مگھوم کر خجے دیکھا۔ اس کی بے رنگ، ادا اس آنکھیں، بے چین اور مضطرب سی نظر آ رہی تھیں۔ ”..... ہاں ایسی میری بہو..... میری بچی ہے....“  
 کیا تمہیں نہیں معلوم؟“ اس نے اہستہ سے کہا۔ جیسے اپنے آپ سے کہہ رہی ہو۔ اس کی

آواز کانپ رہی تھی۔ گفتگو آگے نہ بڑھ سکی۔ کیونکہ اینی واپس آگئی تھی۔ ساتھ ہی جان بھی چائے اور کچھ پیٹری بسکٹ وغیرہ لئے آ پہنچا۔ چائے بناتے ہوئے اینی بولی..... "مسٹر رشید۔ آپ کی وجہ سے آج برج کا لطف آ گیا۔ ورنہ عام طور پر ہم تینوں کٹ مھروٹ ہی کھیلنے ہیں..... آپ کو نہیں معلوم میڈم کو برج سے بڑی دلچسپی ہے!"

"تمہیں بلانے کا خیال دراصل اینی کو ہی آیا تھا۔" میڈم کہنے لگی۔ اس کی آواز اب درست ہو گئی تھی..... کہنے لگی کیوں نہ آج کسی چوتھے پارٹنر کو تلاش کیا جا سکے؟ میں نے تمہارا ذکر کیا تو مبرا ہو گئی کہ فوراً بلاؤ۔

"بہر حال آپ نے اچھا کیا جو مجھے بلایا..... ورنہ کمرے میں پڑے پڑے وحشت ہونے لگی تھی۔" میں نے جواب دیا۔

"آپ یہاں بمبئی میں کیا کام کرتے ہیں؟" اینی نے چائے کی پیالی میری طرف بڑھاتے ہوئے پوچھا۔

"یادہ تر بیکار ہی رہتا ہوں۔" میں نے جواب دیا۔ "کبھی کبھار موقع ملتا ہے تو کسی فلم کے ڈائلاگ لکھ دیتا ہوں۔"

"ادہ..... تو آپ بھی فلموں کے چکر میں مبتلا پہنچے ہیں؟" وہ بولی "یہی سمجھ لیجئے۔"

"یہ بھی ٹھیک ہی ہوا۔ مجھے فلموں کی سٹوڈنگ اور اسٹوڈیوز دیکھنے کا بہت شوق ہے۔ ایک دن آپ کے ساتھ چل کر دیکھنا ہی پڑے گا!" اینی نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "ضرور..... لیکن وہاں جا کر آپ کو ایکٹنگ کا شوق نہ ہو جائے!"

میں نے ہنستے ہوئے جواب دیا۔ میڈم اور اینی بھی ہنس پڑے۔ جان بھی میز کے پیچھے کھڑا مسکرا رہا تھا۔ اس کمرے میں جہاں ہمیشہ خاموشی اور اداسی چھائی رہتی تھی ہنسی کی آوازیں اجنبی سی لگ رہی تھیں!

چائے کے بعد ہماری یہ محفل ختم ہو گئی۔ میں خوش تھا کہ میری وجہ سے ان سب



لوگوں کا دقت اچھی طرح گزرا ..... خاص طور پر میڈم کا! امینی مجھے جھوٹے دروازے تک آئی۔ دروازے پر رک کر آہستہ سے کہنے لگی۔

”رشید صاحب..... آپ کا بے حد شکریہ۔ آپ نہیں جانتے تھے دن بعد میڈم کے ہونٹوں پر ہنسی آئی ہے۔!“

خود اپنی کی آنکھیں حقیقی مسرت سے چمک رہی تھیں۔

اپنے کمرے میں آکر میں سوچنے لگا کیا پیرچ امینی کو میڈم سے اتنی محبت ہے؟ میڈم کی اک ذرا سی خوشی پر وہ کتنی مسرور نظر آرہی تھی! اور پھر میں میڈم کے ہاں اس کی اصل حیثیت کے بارے میں غور کرنے لگا۔۔۔۔ کیا واقعی وہ میڈم کی بیوہ ہے؟ بہت دیر تک میرے ذہن میں یہی سوالات گھومتے رہے۔ کبھی خیال آتا کہیں یہ ساری محبت میڈم کی بلڈنگ کے لئے تو نہیں ہے! میڈم کے بعد اس کا وارث کوئی تو ہوگا ہی! لیکن پھر ذرا یہ خیال ذہن سے نکل جاتا۔ سب جانتے تھے کہ میڈم کی مالی حالت بہت بری ہے۔ یہ بلڈنگ بھی اب اس کی نہیں رہی تھی۔۔۔۔۔ بہر حال امینی میرے لئے عہد بنی رہی۔ دوسرے دن صبح مجھے ایک ضروری کام تھا۔ اس لئے سویرے ہی کمرے سے

نکل گیا۔ نیچے پان دالے کی دکان سے سگریٹ خرید رہا تھا کہ ایسی نظر آئی۔ وہ بھی بلڈنگ سے نکل کر تیز تیز قدموں سے سامنے ریلوے اسٹیشن کی طرف جا رہی تھی۔ اس وقت بڑی اسمارٹ لگ رہی تھی وہ جلدی میں تھی اس لئے میں نے روکنا مناسب نہیں سمجھا۔ پل پار کر کے وہ لائن کے دوسری طرف پلیٹ فارم پر پہنچ گئی۔ ایک دو منٹ بعد ہی لوکل آگئی اور وہ چلی گئی۔ .... اور میں سوچتا رہا کہ آخر وہ کونسی کشش ہے جو ایسی جیسی لڑکی کو اتنی دور سے کھینچ کر یہاں میڈم کے پاس لاتی ہے اور وہ اپنی تھپی کے قیمتی دان اور راتیں یہیں گزار دیتی ہے! اس کے بعد بہت دنوں تک ایسی سے ملاقات نہ ہو سکی۔ میں ان دنوں زیادہ مصروف رہا۔ کمرہ پر بہت کم وقت گزرتا تھا۔ ایک دن دوپہر کو چرچ گیدٹ ریلوے اسٹیشن سے نکل رہا تھا کہ پیچھے سے کسی نے پکارا۔ "ہلو۔ رشید صاحب!" مڑ کر دیکھا تو ایسی ایک دکان سے اتر کر آ رہی تھی۔ .... ہونٹوں پر دھڑی دلفریب مسکراہٹ لئے جس کے بغیر کس کا سارا

حسن بے رنگ تھا قریب آکر بولی۔

”کھینچے اچھے تو ہیں آپ؟ ..... آپ تو اس دن کے بعد سے ایسے غائب ہوئے کہ آج نظر آئے ہیں!“

”اور آپ ہی کونسی نظر آتی رہی ہیں اس کے بعد سے؟“ میں نے ہنستے ہوئے کہا۔

”میں تو اس دوران میں کئی مرتبہ میڈم کے پاس آئی ہوں۔ دوسرے جان کو بھیجا۔

بھی تھا آپ کے لئے ..... لیکن ہر بار آپ کا کمرہ بند ملا۔!“ وہ بولی۔

”ادہ ..... تو پھر تو مجھے آپ سے معافی مانگنی چاہیے!“ میں نے

جواب دیا۔ ”در اصل ان دنوں ایک نئی جگہ کوشش کر رہا تھا کہ کچھ کام بن جائے۔ یہ

وجہ تھی کہ ..... خیر چھوڑیئے ان باتوں کو۔ پہلے یہ بتائیے کیا آپ کی شاہجگ ختم ہو گئی؟“

”ختم ہی سمجھئے۔ کوئی آدمے گھنٹے سے ہلکے سنہری رنگ کا اون تلاش کر رہی

ہوں ..... گہوں کی تازہ بالیوں کے رنگ کا۔ لیکن ابھی تک کہیں نہیں ملا۔ اور نہ اب

یہاں کہیں ملنے کی امید ہے۔“

”کیا وہی رنگ ہونا ضروری ہے؟“

”ہاں۔ بہت ضروری ہے ..... پورے دو مہینے محنت کر کے میڈم نے

میرے لئے جو سوئیٹر بنائے اس میں پھولوں کے ڈیزائن کے لئے یہی رنگ موزوں ہے۔“

”خیر اون تو ملا نہیں ..... اب کیا ارادہ ہے؟ میں اس دن کے ذکر

سے عاجز آ گیا تھا۔

”ارادہ؟۔“ اس نے ہونک کر ہاتھ کی گھڑی دیکھی۔ ”ٹھیک آدمے گھنٹے

بعد مجھے ہاسٹل واپس پہنچ جانا ہے۔“

”آدمے گھنٹے میں ایک پیالی چائے بہ آسانی پی جاسکتی ہے۔“ میں نے کہا

”چلئے اس سنے والے ریٹوران میں بیٹھ کر باتیں بھی ہو سکیں گی۔“

وہ بغیر کسی تامل کے تیار ہو گئی۔ ریٹوران میں داخل ہوتے ہوئے میں سوچنے

لگا کہ آج امینی سے اس کے اور میڈم کے بارے میں ضرور پوچھوں گا۔ لیکن جب ہم بڑے

ہال کے چکنے فرش پر سے گزر کر دوسری طرف ایک علیحدہ میز پر جا بیٹھے تو بہت دیر تک اس موضوع پر گفتگو شروع ہی نہ ہو سکی۔ بالآخر میں نے رکتے رکتے پوچھا.....

”مس اینی۔ میڈم سے..... آپ کا کیا رشتہ ہے؟“  
 ”کچھ بھی نہیں...“ مختصر سا جواب تھا۔

”تو کیا آپ ان کی بہو نہیں ہیں؟“ میں نے تعجب سے پوچھا۔

وہ چند لمبے خاموشی سے میرے چہرے کو دیکھتی رہی۔ مسکراہٹ کی جگہ اس کے چہرے پر سجدی گئی پھیائی ہوئی تھی!..... آخر آہستہ سے بولی — ہوں بھی...  
 ..... اور نہیں بھی!“

عجیب جواب تھا۔ میں چپ ہو گیا، سوچنے لگا کہیں میرے کس طرح پوچھنے پر برا تو نہیں مان گئی! ویٹر چائے کی ٹرے رکھ کر چلا گیا تھا۔ اینی چپ چاپ چائے بنانے لگی..... بالآخر یہ بھڑکی خاموشی ٹوٹی۔ میری طرف دیکھ بغیر اس نے کہنا شروع کیا.....

مستر رشید۔ یہ ایک لمبی کہانی ہے جو اس زمانے سے شروع ہوتی ہے جب مائیکل زندہ تھا۔ مائیکل..... میڈم کا اکلوتا لڑکا..... میرا منگیترا! وہ مجھ سے بہت محبت کرتا تھا۔ وہی مجھے پہلی بار میڈم سے ملانے لیا تھا اور پھر میں اکثر ان کے یہاں آنے جانے لگی..... مائیکل بڑا جذباتی تھا۔ بچوں کی طرح بات بات پر روٹھ جاتا۔ اور پھر جلد ہی من جاتا۔ کبھی کبھی اس کی یہ جذباتیت تکلف دہ بن جاتی تھی۔ پھر بھی میں نے یہ رشتہ منظور کر لیا تھا۔ اس کا دل نیک اور محبت سے بھر پور تھا۔ میڈم کو اس سے بہت محبت تھی..... ہر ماں کو اپنے اکلوتے بیٹے سے ہوتی ہے۔ لیکن میڈم کی محبت کچھ زیادہ ہی تھی! مائیکل کی وجہ سے وہ اپنے شوہر کا غم بھی بھول بیٹھی تھی۔ وہ مجھے بے حد پسند کرنے لگی۔ اسے ہر وہ چیز پسند تھی جو مائیکل کو پسند تھی۔ شاید اسی وجہ سے اس نے اسے ایئر فورس کی ٹریننگ کی اجازت بھی دے دی! ٹریننگ کے بعد ہماری شادی طے ہو چکی تھی۔ میڈم ساری تیاریاں پہلے ہی کر چکی تھی۔ لیکن جب مائیکل کی اڑان کے صرف سات گھنٹے

باقی رہ گئے تھے تو..... تو..... آواز حلق میں اٹک کر رہ گئی۔

”میں جانتا ہوں مس اینی.....“ میں نے اس کی مدد کرنی چاہی۔

”نہیں آپ نہیں جانتے!“ اس نے کہیں دور خلاؤں میں دیکھتے ہوئے کہا۔  
آواز ابھی تک کانپ رہی تھی۔ ”اس دن میڈم کی حالت کا آپ کچھ بھی اندازہ نہیں لگا سکتے!..... وہ بہت بڑا صدمہ تھا..... بہت بڑا! ناقابلِ برداشت! کئی دن تک فریڈم نے یہ ماننے سے انکار کر دیا تھا کہ مائیکل زندہ نہیں ہے! شاید آپ کو نہیں معلوم کہ حادثے کے بعد مائیکل کے جسم کے ٹکڑے بھی نہ مل سکے!“

اس تکلیف دہ موضوع کو چھیڑ کر اب میں بچتا رہا تھا۔ وہ کئی سکند تک نظریں جھکائے چائے کی پیالی کو گھورتی رہی۔ اور پھر ایک دم اٹھا کر ہونٹوں سے لگائی۔ اس کی آنکھوں کو دیکھ کر مجھے محسوس ہوا جیسے ان کی گہرائیوں میں مائیکل کی محبت پھر ایک بار جاگ اٹھی ہو! پھر ایک بار ان نہاں خانوں میں یادوں کے شعلے کو ندن لگے ہوں؟ یہ آگ، یہ شعلے بجھ نہ سکیں گے، میں نے سوچا۔ یہ آگ کبھی سرد نہ ہوگی!..... ایسی کہہ رہی تھی.....

”مائیکل کی موت سے میڈم پاگل ہو گئی تھی۔ اس کے ہوش و حواس جلتے رہے تھے۔ ڈاکٹر کہتا تھا کہ یہ حالت اور دو چار دن رہی تو یہ بچ نہ سکے گی۔ اس کا غم دیکھ کر میں اپنا غم بھول گئی۔ میرا دل اس کے لئے رحم..... بے پناہ رحم سے ٹرپ اٹھا! اور پھر میں نے فیصلہ کر لیا کہ میں اسے بچاؤں گی..... میں اسے زندہ رکھوں گی۔ مجھے یاد ہے وہ دن جب میں نے اسے دونوں ہاتھوں سے جھنجھوڑتے ہوئے کہا تھا کہ آخر وہ اتنی پریشان اتنی مایوس کیوں ہے؟ اس کا بیٹا زندہ نہیں ہے تو کیا ہوا۔ میں بھی تو بیٹی ہوں! میں مائیکل ہی تو ہوں! میں اس کے لئے زندہ رہوں گی۔ میرا بھی تو یہی گھر ہے!“ ایسی کہتے کہتے رک کر میری طرف دیکھنے لگی۔ اس کا سانس پھول گیا تھا وہ مجھے ایسی نظروں سے دیکھ رہی تھی جیسے اپنی باتوں کا رد عمل معلوم کرنا چاہتی ہو۔ میں بالکل خاموش تھا۔

چند لمحے سستا کر اس نے پھر آہستہ آہستہ کہنا شروع کیا۔ ”مجھے یاد نہیں

اس دن میں نے کیا کیا کہا ! لیکن اس کے بعد میڈم کی دماغی حالت میں ایک بڑا تغیر پیدا ہو گیا۔ اس کی حالت سنبھلتی چلی گئی ..... مجھے وہ لگا ہیں اب بھی یاد ہیں۔ جن سے میڈم نے اس دن جیسے پہلی بار مجھے دیکھا تھا ! جیسے وہ مجھے نہیں اپنے مائیکل کو دیکھ رہی ہو۔ رنتہ رنتہ وہ مجھے شدت سے پیار کرنے لگی۔ اب اس کی زندگی کا سہارا میں ... .. صرف میں ہوں اور رشید صاحب ! یہ خیال مجھے کس قدر تسکین دیتا ہے ... .. آپ اس کا اندازہ نہیں لگا سکتے ! اب مجھے ذرا سا بھی موقع ملتا ہے تو میڈم سے ملنے چلی جاتی ہوں اس کے یہاں اس طرح رہتی ہوں جیسے وہی میرا اصلی گھر ہے۔ اور اس بات سے اُسے بے انتہا مسرت ہوتی ہے۔ فرصت ہوتی ہے ورات کو بھی ہڑ جاتی ہوں۔

میں چپ چاپ اس کے چہرے کو گھورتا رہا۔ کسی اندرونی مسرت سے اس کی آنکھوں میں نئی چمک آگئی تھی ..... ”رشید صاحب میں نہیں جانتی کہ یہ رحم ہے یا کیا“ جو مجھے میڈم کے ساتھ اس معنوی سے باندھ ہوئے ہے ..... اور اب اس کی گرفت سے نکلنا میرے بس سے باہر ہو گیا ہے !“ اس نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔

ریسٹوران سے نکلنے وقت پتہ چلا کہ اسے پندرہ منٹ کی دیر ہو چکی ہے۔ جب بھی موقع ملتا میں میڈم کے یہاں ضرور جاتا۔ دیر تک باتیں ہوتیں۔ دوران گفتگو میں وہ امینی کا ذکر بار بار کرتی۔ امینی پر اسے ناز تھا۔ اس کے ذکر پر اس کی آنکھیں غرور سے چمکنے لگتیں ..... ایک مرتبہ ایسے ہی کسی موقع پر اس نے کہا تھا۔ ”میرے مائیکل کی پسند کوئی ایسی ویسی تھوڑی تھی“

کبھی امینی بھی دیاں مل جاتی۔ ہم سب مل کر خوب باتیں کرتے یا پھر ری برج کیلے رہتے۔ کبھی کبھی سارا دن وہیں گزار دیتا۔ امینی کا ہر جگہ میڈم کے جسم میں ایک نئی طاقت، نئی روح پھونک دیتا۔ اور وہ چند دن اور دھکیلنے کے قابل ہو جاتی۔ یہ بات یقینی تھی کہ اب امینی کے بغیر اس کا ایک دن بھی زندہ رہنا ممکن نہیں ہے۔

اور پھر اپنی دنوں ایک عجیب انکشاف ہوا ..... وہ ایک ابراہم کو دشمن تھی۔ بارش ابھی ابھی رک تھی اور تیز ہوائیں چل رہی تھیں، میں جو ہو پرسندر کے کنارے کنارے

ٹہل رہا تھا۔ اس دن میں ذہنی طور پر کچھ پریشان سا تھا اور یونہی وقت کاٹنے ادھر آنکلا تھا۔ ٹہلتے ٹہلتے تھک گیا تو وہیں ریت پر بیٹھ کر بل کھاتی ہوئی سوجن کو دیکھنے لگا۔ اوپر بادلوں کے کنارے رنگین ہوتے جا رہے تھے۔ غروب آفتاب کی تیاریاں شروع ہو چکی تھیں۔ آفتاب کے پاس آبی پرندوں کی لمبی لمبی قطاریں سرمئی بادلوں کے پس منظر میں شفقت کی سرخی سے چمک اٹھی تھیں۔ میں ساحل پر دو رنگ پھیلے ہوئے ناریل کے درختوں کی توسوں کو دیکھنے لگا۔ اس دن پنج پر لوگوں کی تعداد بہت کم تھی۔ ایسے میں ایک چھوٹی نیلے رنگ کی کار ناریل کے درختوں کے نیچے آکر رکی۔ دروازہ کھلا اور اس میں سے اپنی برآمد ہوئی۔ جو شخص موٹر چلا رہا تھا وہ بھی اتر آیا۔ اسے میں نے پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ کوئی تیس بیس سال کا خوش پوش اور عرش وضع آدمی تھا۔ وہ دونوں اب سمندر کی طرف آ رہے تھے۔ اپنی کے خوبصورتی سے جمائے ہوئے بال بار بار ہوا سے کچر جاتے اور وہ پھر انہیں درت کر لیتی۔ اس کی ہلکے سُرخ رنگ کی ساڑھی نے شام کی رنگینی میں اور اضافہ کر دیا تھا۔ دوڑ بے حد سرور نظر آ رہے تھے۔ ..... خاص طور پر اپنی۔ جسے عموماً میں نے خاموشی اور اس ہی دیکھا تھا۔

بتہ نہیں کیوں اپنی کو وہاں اس حالت میں دیکھ کر میرے ذہن کو ایک دھچکا سا لگا۔ اٹاؤ اسے اس طرح دیکھنے کے لئے میرا ذہن پہلے سے تیار نہیں تھا۔ ..... مجھے یوں محسوس ہو رہا تھا، جیسے ان لوگوں کو دیکھ کر میں نے کوئی برا کام کیا ہو! جی میں آیا کہ جلدی سے اٹھ کر کہیں چھپ جاؤں۔ ..... لیکن ادھر اس دوران میں اپنی نے مجھے دیکھ لیا تھا۔ وہ ٹھٹھک کر کھڑی ہو گئی۔ اس کے پاؤں جیسے گیل ریت میں دھنس کر رہ گئے تھے صرٹ ایک لمحے کے لئے اس کے چہرے پر بے چینی کے آثار بکھر کر غائب ہو گئے اور اب پھر وہاں وہی معصوم اور دلکش مسکراہٹ پھیلتی جا رہی تھی۔ جلدی جلدی میری طرف بڑھتے ہوئے پکاراٹھی۔ ”ہیلو سٹر رشید!“ اور قبل اس کے کہ میں اٹھ کر حواس بجا کر لیتا، وہ اور اس کا ساتھی میرے پاس پہنچ چکے تھے۔

”کتنا دلچسپ اتفاق ہے۔“ اپنی بولی۔ اس کے لہجے میں کہیں بھی بناوٹ یا

تصنع کی جھلک نہیں تھی۔ اس ڈبیلر پر اسے غفلت نہیں بلکہ حقیقی مسرت ہو رہی تھی۔ پتھرے ہوئے سانسوں کے درمیان دم لیتے ہوئے وہ جلدی جلدی کہہ رہی تھی..... ”سچ پر سچ کی شام بڑی خوبصورت ہے!..... ہے ناشیام؟“

اور جواب میں شیام نے مسکراتے ہوئے گردن ہلادی میننی کے لہجے میں ایسی شرمی میں نے پہلے کبھی نہیں دیکھی تھی۔ یکایک چونک کر بولی ”ارے میں نے ابھی تک آپ دونوں کا تعارف بھی نہیں کرایا!..... یہ ہیں سسٹر رشید میرے بہت اچھے دوست..... اور یہ ہیں شیام، ہمیں کبھی کے بہت بڑے بزنس مین۔“

اس کے بعد ہم تینوں بہت دیر تک جو ہو کی ٹھنڈی ریت پر ٹہلتے رہے۔ بہت سی باتیں ہوئیں میں نے اندازہ لگایا کہ شیام اور امینی ایک دوسرے کو غصے سے جانتے ہیں۔ بری طرح ایک دوسرے کو چاہتے ہیں۔ شیام کو اپنی محبت پر پورا بھر دے تھا۔ میری اور امینی کی بے تکلف باتوں پر اسے ذرا بھی برا نہ لگا۔ شاید وہ میرے بارے میں پہلے سے جانتا تھا! اسے میڈم کے متعلق بھی سب کچھ معلوم تھا۔... بہر حال وہ مجھے ایک سمجھدار خوش اخلاق اور خوش مذاق انسان نظر آیا۔ جب واپس ہونے لگے تو امینی میرا ہاتھ پکڑ کر کہنے لگی۔

”رشید صاحب۔ آپ میرے ساتھ چلیں گے..... میرے گھر۔ آپ سے ابھی

اور باتیں کرنی ہیں۔“

”کیا ابھی چلنا ہو گا؟“ میں نے پوچھا۔

”ہاں۔ اسی وقت۔“ اس نے جواب دیا۔

واپسی میں امینی میرے ساتھ پیچھے کی سیٹ پر بیٹھی۔ شیام ڈرائیو کر رہا تھا۔ راستے میں کسی نے کسی سے کوئی بات نہیں کی جب موٹر سٹرل ہاسپٹل پر رکی اور میں اور امینی اترنے لگے تو شیام پلٹ کر بولا۔

”سنو امینی۔ رشید صاحب سے آئندہ اتوار کا اپوائنٹ منٹ لے لیتا۔“

ڈنر کے بعد کچھ بھی دیکھی جائے گی۔ ٹھیک ہے نا؟

”ٹھیک ہے۔“ امینی بولی۔

”اچھا بائی بائی۔“

”بائی بائی۔“

”بائی بائی مسٹر رشید۔“ اور شیام چلا گیا۔

ایمنی کے گھر میں پہلی دفعہ آیا تھا۔ مختصر کوارٹر تھا۔ مشکل سے دو کمرے ہوں گے۔ جس کمرے میں ہم بیٹھے تھے اسے بہت تھوڑے لیکن عمدہ فرنیچر سے ڈرائیونگ روم کے لئے آراستہ کیا گیا تھا۔ گھر میں ایک بوڑھی خادمہ تھی جسے بلاکر ایمنی نے چائے کے لئے کہہ دیا۔

”شیام بالو مجھے خاصے اچھے آدمی معلوم ہوئے۔“ خادمہ کے جانے کے بعد میں فوراً اصل موضوع پر آ گیا۔ ایمنی بھی بظاہر ہی چاہتی تھی وہ کھڑکی پر پردہ درست کر رہی تھی۔ چونک کر میری طرف پلٹی۔

”اوہ!..... شکریہ“ اس نے کہا۔ ”آج آپ سے اچانک ملاقات ہو جانا اچھا ہی ہوا۔ کتنی بار چاہا تھا کہ شیام کے بارے میں آپ کو بتاؤں۔ لیکن یہ بار کسی ذکسی وجہ سے بات ملتے گئی..... یا پھر شاید ایسے ہی کسی موقع کا انتظار تھا جو اتنا ہی سے آج ہاتھ آ گیا۔“ وہ آکر میرے مقابل کرسی پر بیٹھ گئی۔

”آپ شیام کو کب سے جانتی ہیں؟“ میں نے پوچھا۔

”کوئی دس سال سے۔“ وہ بولی۔ ”وہ اور میرا بھائی کا لچ کے زمانے کے دوست

ہیں۔ لیکن میں نے اسے پہلی بار اس دن دیکھا تھا جب وہ میرے بھائی سے ملنے یہاں گھر پر آیا تھا۔ میرا بھائی ایک عرصے سے کلکتہ میں مقیم ہے۔ وہاں اس کی ریڈیو کی دکان ہے..... ان دنوں مجھ سے ملنے بھی آیا ہوا تھا۔“ وہ دیوار پر اپنے بھائی کی تصویر دیکھتے ہوئے بولی۔ ”پانچ سال بڑا ہے۔“

لیکن میں اس وقت اس کے بھائی کے بارے میں نہیں، شیام کے بارے میں

سننا چاہتا تھا۔

”شیام بہت دولت مند گھرانے کا لڑکا ہے۔“ آخر وہ بولی۔ ”خود بھی لاکھوں کا



کاروبار کرتا ہے۔ شروع شروع میں مجھے اس کا روزِ روزِ یہاں آنا اچھا نہیں لگتا تھا۔ کئی بار اسے منع بھی کیا۔ مگر نہیں مانا۔ بھائی واپس کلکتہ چلا گیا۔ لیکن وہ برابر مجھ سے ملنے آتا رہا۔ آخر ایک دن میں نے اسے اپنی اور مائیکل کی تمام کہانی سنائی۔ میڈم کے متعلق بھی بتا دیا۔ میرا خیال تھا یہ سب سننے کے بعد وہ آنا چھوڑ دے گا..... لیکن..... لیکن.....

...“ وہ یکایک چپ ہو گئی۔

” اس نے شادی کی پیش کش کر دی..... یہی ہے نا؟“ میں نے اس کا جملہ پورا کرتے ہوئے کہا۔

” بالکل یہی۔“ اپنی نے میری طرف دیکھے بغیر جواب دیا۔ ” وہ مجھ سے محبت کرنے لگا تھا..... شدید محبت! لیکن میں نے اس کی پیش کش ٹھکرا دی۔ اس وقت میرے دل میں اس کے لئے ایسے کوئی جذبات نہیں تھے..... یا پھر شاید وہ اتنے شدید نہ ہو سکے تھے۔ میں میڈم کو چھوڑنے کا تصور بھی نہیں کر سکتی تھی..... میرے انکار کے باوجود شام برابر آتا رہا۔ اس کے رویے میں کوئی تبدیلی نہیں ہوئی۔ البتہ پھر کبھی اس نے شادی یا محبت کا ذکر نہیں چھیڑا۔ اور پھر رفتہ رفتہ میں اس کے ساتھ گھومنے یا سہارا دیکھنے بھی جانے لگی، میں نے اسے زیادہ قریب سے دیکھا تو وہ ایک سمجھدار اور شریف آدمی لگا..... ہم آہستہ آہستہ دو بے تکلف دوستوں کی طرح ساتھ رہنے لگے!“

” کیا میڈم سے آپ کا ملتے رہنا شام کو پسند تھا؟“ میں نے درمیان میں پوچھا۔

” ہاں اس پر اس نے کبھی برا نہیں مانا۔ بلکہ کئی بار وہ خود مجھے ٹرین میں دہان تک چھوڑنے جا چکا ہے!“ اپنی نے کہا۔

اور میں سوچنے لگا۔ شام عام لوگوں سے کتنا مختلف ہے!.....

اپنی کہتی جا رہی تھی.....

” اور پھر ایک دن میں نے اپنی زندگی کے بارے میں سنجیدگی سے غور کیا۔ اپنے مستقبل کے متعلق سوچا..... کیا میں ساری عمر اسی طرح اپنی ناکامیوں کا ماتم کرتے ہوئے گزار دوں گی؟..... کیا میں اکیسویں زندگی کی ان تاریک راہوں سے گزر سکوں گی؟

اتنی بڑی آزمائش، اتنی سخت سزا آخر کس لئے! اُس دن مجھے محسوس ہوا۔ جیسے اپنے آپ کو دھوکا دیتی رہی ہوں۔ دلت کے ساتھ انسان کے سوچنے اور سمجھنے کے دھارے بدل جاتے ہیں۔ مائیکل کے بعد پچھلے چار باؤنچ برسوں میں میرے اند بھی کئی تبدیلیاں آگئی تھیں! ..... یہ ایک حقیقت ہے۔ بالکل ویسی ہی جیسی مائیکل کی محبت ایک حقیقت تھی! نہ یہ جھوٹ ہے، نہ وہ جھوٹ تھا!“

”اور پھر آپ نے شام سے شادی کا وعدہ کر لیا؟“ میری دلچسپی بڑھتی جا رہی تھی۔ جواب دینے کی بجائے امینی مجھے چپ چاپ گھورنے لگی۔ اس دلت اس کے چہرے سے کسی قسم کا تاثر، کوئی ردِ عمل ظاہر نہیں ہو رہا تھا جیسے وہ رنج و مسرت سکون و اضطراب کے درمیان پرکھڑی ہو! بالآخر اُہستہ سے بولی۔

”شام سے ابھی میں نے کوئی وعدہ نہیں کیا ہے۔ وہ جانتا ہے۔ اُس نے اب ہر چیز ہر فیصلہ، ہر موڑ، میری مرضی پر چھوڑ دیا ہے۔ ایسا اس نے کبھی زبان سے نہیں کہا۔ لیکن میں جانتی ہوں۔“

”پھر آپ نے کیا فیصلہ کیا ہے؟“

”رشید صاحب۔ کیا آپ سمجھتے ہیں اگر میں شادی کروں تو میڈم زندہ رہے گی؟“ امینی تقریباً چیخ کر لیلی۔ وہ اضطرابی طور پر کرسی سے اٹھ کر پہنچنے لگی۔ ”نہیں یہ نہیں ہو سکتا۔ میں میڈم کو نہیں چھوڑ سکتی۔ وہ مر جائے گی۔۔۔۔۔۔ میرے بغیر زندہ نہ رہ سکے گی! ..... میں جانتی ہوں، اچھی طرح جانتی ہوں۔ میں اُسے ذرا سا بھی دکھ نہیں پہنچا سکتی! اور ..... اور نہ میں شام کو چھوڑ سکتی ہوں۔ میں اس کی محبت کی راہ میں بہت دور نکل چکی ہوں۔۔۔۔۔۔ مجھے اس کا احساس ہے! میں اس کے ساتھ مستقبل کے خوبصورت نکل کھڑے کر چکی ہوں۔ میں نے پھر ایک بار جینے کی کوشش کی ہے۔ اپنی زندگی کے بکھرے ہوئے اوراق جمع کئے ہیں۔ اگر اب بکھر گئے تو پھر کبھی یکجا نہ ہو سکیں گے! کبھی نہیں! ..... اودہ میں کیا کروں! ..... رشید صاحب! ..... بتائیے میں کیا کروں!“ وہ میرے سامنے آکر کھڑی ہو گئی۔ اس کا سانس

بھول گیا تھا۔ اور ہاتھوں کی ٹھکیاں بار بار کھلتی اور بند ہوتی جا رہی تھیں.....

میری سمجھ میں کچھ نہ آیا کہ کیا جواب دوں! اس کی زندگی کا یہ رخ میرے لئے نیا تھا اور اس کے بارے میں اتنی جلدی بھلا کیا سوچ سکتا تھا، میں خاموش رہا۔ اپنی بھی اب خاموش تھی..... تھکے تھکے قدموں سے چلتی ہوئی اپنی کرسی پر جا کر بیٹھ گئی۔  
مجھے یاد ہے اس رات اپنے کمرے میں واپس آ کر بہت دیر تک میں سو نہیں سکا تھا۔ اپنی کا وہ سوال بار بار ذہن میں نشتر سے چھجھوتا رہا..... ”اب کیا کروں؟“  
رشتید صاحب بتائیے اب میں کیا کروں؟.....

اپنی کیا کرے؟..... اس کا جواب نہ مجھے معلوم تھا اور نہ خود اپنی کو۔  
حالات دیسے ہی رہے۔ دن گزرتے گئے۔ میں اپنی اور میڈم سے برابر ملتا رہا۔ میڈم کے ساتھ اپنی کے برتاؤ میں کوئی فرق نہیں آیا تھا..... وہی خلوص تھا، وہی محبت تھی! کون کہہ سکتا تھا کہ یہ سب کچھ محض رحم کی بنیادوں پر قائم ہے!..... اس دوران میں شیا م سے بھی کئی بار مل چکا تھا۔ اپنی کے یہاں وہ پابندی سے آتا رہا۔ ان دونوں کو ایک ساتھ دیکھ کر میں ہمیشہ یہی سوچتا کیا سچ بچ انہوں نے اب تک شادی نہیں کی؟  
اور پھر یہ ہو کہ کچھ دنوں تک میں کسی سے نہیں مل سکا۔ میں اپنے کاموں میں الجھا رہا اپنی یا میڈم کی کوئی خبر مجھے نہ مل سکی بالآخر ایک دن شام کو گھر پہنچا تو اپنی کا خط پڑا ہوا ملا۔ اس نے صرف دو جملے لکھ دیے تھے۔ ”جمعہ کی صبح کو میں اور شیا م شادی کر رہے ہیں۔ ٹھیک دس بجے میرے یہاں پہنچ جانا۔“

مجھے یوں لگا جیسے یہ آتش فشاں جواب تک اپنے اندر تمام شعلوں کو چھپائے خاموش کھڑا تھا، اب پھٹ پڑے گا۔ وہ موڑ، وہ نقطہ آ پہنچا ہے جو حالات کے اس تعطل کو ختم کر دے گا!..... اس کا آنا لازمی تھا۔ اس اہم فیصلہ پر پہنچنے سے پہلے اپنی کو کس ذہنی کشمکش و معانی ازیت سے گزرتا پڑا ہوگا۔ اس کا مجھے اندازہ تھا.....  
ان دو جملوں کے پیچھے کتنے طوفان، کتنے اندیشے اور کتنے دلوں پر شدید تھے۔ اس وقت میرے ذہن میں صرف ایک سوال گھوم رہا تھا..... میڈم کا کیا ہوگا؟ اپنی نے

میڈم کے متعلق کیا سوچا ہے؟ ..... کیا جن ہاتھوں سے اس نے میڈم کو نئی زندگی بخشی تھی انہی ہاتھوں سے وہ اس کا گلا گھونٹ دے گی۔؟

خط مجھے جمہرات کی شام کو ملا تھا۔ رات بھر میں یہی سوچتا رہا ..... میڈم کا کیا ہو گا۔

دوسرے دن ٹھیک دس بجے میں امینی کے یہاں پہنچ گیا۔ شام آچکا تھا۔ اس کے چہرے سے کوئی خاص بات ظاہر نہیں ہو رہی تھی۔ ہمیشہ کی طرح خاموش اور مطمئن سا بیٹھا تھا۔ قہقہوں میں امینی بھی اندر سے تیار ہو کر آگئی۔ حسب معمول معمولی سا میک اپ تھا۔ ان دونوں کو دیکھ کر کوئی یہ نہیں کہہ سکتا تھا کہ شادی کے لئے گھر سے نکلے ہیں! ..... اور پھر ہم تینوں شام کی کامیابی میں سول میرج کے دفتر روانہ ہو گئے، شادی وہیں ہونی طے پائی تھی۔

امینی آج بھی میرے ساتھ پیچھے کی سیٹ پر بیٹھی تھی۔ شام ڈرائیو کر رہا تھا۔ وہاں کار میں پہلی بار مجھے محسوس ہوا۔ جیسے اسنی کچھ گھبرا سکی گئی ہے۔ وہ اپنے خیالوں میں گم ہوئے آنے والے واقعے کے تصور میں کھوئی ہوئی بیٹھی تھی۔ آج اس کے چہرے پر ایک دفعہ بھی مسکراہٹ کے حسین نقش اکھرنہ سکے! راستے میں اس سے میں نے صرف اتنا پوچھا۔ ”میڈم کے بارے میں کیا سوچا ہے۔؟“

اور اس نے میری طرف دیکھے بغیر جواب دیا۔ ”سوچ لیا ہے۔“  
شائد وہ بتانا نہیں چاہتی تھی یا پھر شاید اب تک خود اسے بھی معلوم نہیں تھا کہ کیا کرنا ہے! میں نے پھر کچھ نہیں پوچھا۔

میرج آفس پر شام کے دو تین بے تکلف دوست اور امینی کی ایک سہیلی منظر کھڑے تھے۔ شادی کے مراحل طے پانے تک گیارہ بج گئے۔ آفس سے نکلنے وقت امینی نسبتاً پرسکون نظر آرہی تھی۔ وہاں سے نکل کر ہم سب تاج برٹول پہنچے جہاں شام نے ایک پارٹی کا انتظام کر رکھا تھا۔ یہاں کچھ اور دوست احباب بھی مدعو تھے۔ پارٹی کے دوران ہلکے ہلکے تہنہوں اور لطیفوں نے سنجیدگی کا احساس کسی قدر کم کر دیا جو اتنی

دیس سے ذہنوں پر تسلط تھا۔ اپنی آہستہ آہستہ نارمل ہوتی جا رہی تھی۔ پاٹی کے بعد ٹھیک ایک بجے ہم سب اپنی اور شیا م کو خدا حافظ کہنے وکٹوریہ ٹرینس پہنچے وہ دونوں ہنی مولن کے لئے کھنڈالہ جا رہے تھے۔ ریل کے چلتے وقت اپنی نے مجھے قریب بلا کر آہستہ سے کہا.....  
 ”گھبرائیے نہیں۔ میں نے سب کچھ سوچ لیا ہے“

لیکن جس وقت میں ویسٹرن ریلوے کی لوکل میں واپس اپنے کمرے کو جا رہا تھا تو راستے بھر ہی سوچتا رہا کہ آخر اپنی نے کیا سوچا ہے !  
 کیا اب بھی وہ میڈم سے ملنے آیا کرے گی۔؟

میڈم کے فلیٹ کے سامنے سے گزرتے ہوئے میرے قدم ایک لمحے کے لئے خود بخود رک گئے۔ دروازے پر پردہ پڑا تھا اور اندر ہمیشہ کی طرح خاموشی تھی۔ میں پردے میں سے اندر بھانکے بغیر نہ سکا..... میڈم ایک صوفے پر بیٹھے بیٹھے اندکھ گئی تھی!... پیچھے دیوار پر مائیکل کی تصویر آویزاں تھی۔ وہی بچوں کی سی معصوم مسکراہٹ لئے ہوئے!..... اور پھر میں اپنے کمرے میں چلا آیا۔

دوسرا دن کسی واقعے کے بغیر گزر گیا۔ دن بھر اپنے کاموں کے سلسلے میں ادھر ادھر گھومتا رہا۔ رات کو تھک کر جلد ہی سو گیا۔ تیسرے دن اتارا تھا۔ دیر تک سوتا رہا۔ اٹھ کر منہ ہاتھ دھویا۔ ناشتہ کیا اور باہر نکلنے کے ارادے سے کمرہ بند کر رہا تھا کہ جان آتا ہوا دکھائی دیا۔ معلوم نہیں کیوں اسے دیکھ کر میں گھبرا گیا۔

”میڈم نے کہا ہے اگر فرصت ہو تو تشریف لائیے“ وہ قریب آ کر بولا۔

”کیا وہ اکیلی ہیں؟“ شاید میری آواز کانپ رہی تھی۔

”نہیں س اپنی بھی آئی ہیں۔“

ایک ہلکی سی سرد لہر سر سے پیسے تک دوڑ گئی۔ چند لمحے وہیں بے حس و حرکت کھڑا رہا۔ جیسے پاؤں زمین سے چپک کر رہ گئے ہیں! کوئی میرے کانوں میں بار بار دہرا رہا تھا۔ ”اپنی آئی ہے..... اپنی میڈم سے ملنے آئی ہے!“ اور پھر میں چونک پڑا، جان مجھے عجیب سی نظروں سے تنگ رہا تھا۔ میں فوراً اس کے ساتھ روانہ ہو گیا اپنی آئی ہے

تو اس میں میرے اتنے پریشان ہونے کی کوئی بات ہے! میں سوچنے لگا۔  
 لیکن پھر بھی میڈم کے فلیٹ میں داخل ہوتے وقت میرا دل بری طرح دھڑک  
 رہا تھا۔ میڈم کے یہاں ہر چیز حسب معمول تھی۔ کہیں بھی کوئی غیر معمولی بات نظر نہیں آئی۔  
 ایسی اور وہ میز پر جھکے ہوئے کسی میگزین میں تصویریں دیکھ رہے تھے۔ ایسی کے چہرے سے  
 کوئی خاص بات نمایاں نہیں تھی اس کے کپڑے، بالوں کی سجاوٹ، اس کا سراپا.... سب کچھ ویسا  
 ہی تھا، جو ہمیشہ ہوا کرتا تھا! ہنر مند کے کناروں پر ہلکی سی مسکراہٹ بھی ویسی دلکش، ویسی  
 معصوم تھی! کہیں بھی، کوئی ذرا سا بھی تغیر ڈھونڈنے سے نہیں ملتا تھا۔ میڈم کی آنکھوں میں  
 بھی وہی پیارا، وہی خلوص تھا جو ہمیشہ ایسی کی موجودگی میں پیدا ہو جاتا تھا۔ مجھے دیکھ کر وہ ہولے  
 سے مسکرا دی۔ اور ایسی ہمیشہ کی طرح چہک کر بولی۔ ”ہلور شید صاحب!“

ادب ہر بات میری سمجھ میں آتی جا رہی تھی۔ ذہن پر سے وہ سارا بار، اعصابی  
 تناؤ اترتا جا رہا تھا جو اتنی دیر سے مسلط تھا۔ مجھے ایک گونہ سکون محسوس ہوا۔!  
 میڈم کے فلیٹ میں آج بھی ہر چیز ویسی ہی تھی۔ کچھ بھی تو نہیں بدلا تھا!  
 اب یہاں کی کوئی چیز نہیں بدلے گی۔ یہ ماحول، یہ کمرہ، یہ دن، یہ راتیں، میڈم، اور میڈم  
 کی بیماری، نفیسی سبجی، ایسی یہ سب ویسے ہی رہیں گے۔ اس کے کمرے کے اندر نہ تو وقت  
 آگے بڑھے گا۔ اور نہ زمانہ خالص طے کرے گا۔ باہر سینکڑوں  
 تغیرات ہوں گے۔ نئے نئے واقعات اور حادثات رونما ہوں گے، دنیا آگے بڑھے گی اور زندگی  
 منازل طے کرے گی۔ لیکن یہاں کچھ نہ ہوگا! وقت یہاں کسی میز کے نیچے ڈبک کر سویا پڑا رہے گا۔  
 .... میڈم وہی رہے گی۔ ایسی وہی رہے گی اس نے کہا تھا نا.... میں نے سوچ لیا  
 ہے۔ آپ نکر نہ کریں۔؟“

اور پھر ہم لوگ برج کھیلنے لگے۔ چائے آئی۔ باتیں ہوئیں۔ وقت اسی طرح گزر گیا  
 جیسے پہلے ہمیشہ گزرا کرتا تھا۔ میڈم خوش تھی، ایسی خوش تھی اور جب میں جلنے لگا تو ایسی خند لگانا  
 کہنے دروازے تک بھی آئی۔ اسکی مسکراہٹ آج ہمیشہ سے زیادہ خوبصورت معلوم ہو رہی تھی۔  
 ”آج رات میں یہیں میڈم کے ساتھ رہوں گی۔“ اس نے آہستہ سے کہا۔ ▲▲

## نجات کا لمحہ

ایک نئی استغنائی مسکراہٹ ہونٹوں پر لئے جب وہ گھبراہٹ سے اسے سرور دیکھ کر حیران رہ گئے۔ یہ لوگ اسے دیکھ کر ہمیشہ حیران کیوں ہو جاتے ہیں ! اس دن اس نے ٹھیک سے کھانا کھایا۔ ڈھنگ سے کپڑے پہنے۔ اور گنگنا تا ہوا باہر نکل گیا۔ مگر باہر..... وہی دیران بستی، بے جان لوگ، بے نظر آنکھیں ! اداس سناٹا اس سے سرگوشی کرنے لگا۔

..... بتاؤں گا..... بتاؤں گا تمہیں بھی اپنی مسکراہٹ کا راز، پھر کوئی مشکل نہیں رہے گی۔ میں نے گھنٹیوں کی آواز سُن لی ہے، دور سے ہی سہی ! ذرا پگ ڈنڈی پر ہو تولوں..... تم سے کہوں گا۔

پہلے تین دن بڑی تیزی سے گزر گئے۔ جب سے بوتشی نے بتایا تھا، ٹھیک تو ہیں دن وہ اس دنیا میں نہیں رہے گا، اس کے دماغ کا سارا ہیجان ایک نخت ختم ہو گیا۔ اس نے منزل کو پالیا تھا۔ انتظار اور بے یقینی کا اضطراب باننا ختم ہونے والا تھا !..... بوتشی کے الفاظ امرت کے قطرے بن کر اس کے کانوں میں اتر پڑے تھے۔ ساتواں دن اس کی نجات کا دن ہو گا !

بہت سے کام ہو ادھر سے پڑے تھے، اس نے پورے کر لئے۔ جن سے کتر کر نکل جاتا تھا، جا جا کر خود ملتا رہا۔ اچانک ان نوازشوں پر دوست، دشمن سب حیران رہ گئے۔ اتنا خوش کیوں ہے ؟..... پھر وہی حیرانی !... کل تک تو کالیل بختی تو خوف سے چادر تان لیتا تھا !

\_\_\_\_\_ بے وقوف۔ آج جبرانی مجھے ہو رہی ہے۔ کب تک ویران بستیوں کی نکیل  
سڑکوں پر اپنے کھوکھلے جسموں کو گھسیٹتے رہو گے؟ سناٹے کی آواز کیوں نہیں سنتے؟  
دُور گھنٹی کی آواز.....

مگر پھر یوں ہوا کہ رفتہ رفتہ اس کی خوشی جسے مقدس راز بنا کر اس نے اپنے اندر  
تہوں میں لپیٹ رکھا تھا بے اطمینانی میں بدلنے لگی۔ وہ استغنائی مسکراہٹ کہیں تحلیل ہوتی گئی۔  
شروع کے تین دن، جب بھی گھر میں ہوتا، بان کی چار پائی پر چادر تان کر آرام سے  
لیٹ جاتا..... دن ہو یا رات۔ اور لمحوں کے گزرنے کو محسوس کرتا۔ ہر لمحے کو کچھ دیر کے لئے  
اپنی گرفت میں رکھتا۔ اس کے وجود کو محسوس کر کے آزاد کر دیتا۔ اس میں اسے ایک مسرت ملتی۔  
\_\_\_\_\_ کچھ ہی دنوں میں تم مجھے نہ پاسکو گے، مجھے چھو کر نہ پاسکو گے۔ میں تمہارا  
کرب سے آزاد ہو جاؤں گا۔ وہ کرب میں تمہیں دے جاؤں گا \_\_\_\_\_

مگر اب \_\_\_\_\_ جو تھے دن سے چار پائی پر لیٹا تو کسی آن دیجے خوف نے اسے گرفت  
میں لے لیا۔ یہ ایک نیا تجربہ تھا۔ دل کے کسی کونے میں خواہش پیدا ہوئی کہ..... لمحات  
کا پیہم آہستہ گھومے۔ وقت کا سیل دھیمّا پڑ جائے۔

\_\_\_\_\_ کیوں؟..... ایسا کیوں ہوا؟..... کیا یہ ڈر ہے؟..... آنے  
والے ساتویں دن کا ڈر؟..... یہم دبا دبا اضطراب۔ دل بیٹھا جا رہا ہے! وہ سرد آگس  
کیفیت کہاں گئی؟..... پنجرے کا دروازہ تو کھلنے والا ہے!۔

خوف بڑھتا گیا۔ صبح ہوتی تو چادر سر پر کھینچ لیتا کہ نیا دن اتنی جلدی نہ آجائے۔  
شام ہوتی تو اندھیرے کو دونوں ہاتھوں سے روکتا..... پرے دھکیلتا۔ پر کچھ نہوتا۔  
رات چھت سے اتر کر آنکھیں میں آجاتی اور ہول کے بر فیصلے ہاتھ پھیلا دیتی۔

یہم کیسا ہول ہے!..... عجیب، اجنبی سا ڈر! جو بڑھتا ہی جا رہا ہے۔ ہر پل  
ہتھوڑے کی ضرب کا وقفہ کم ہوتا جا رہا ہے۔ اور دل کنوئیں میں اترتا جا رہا ہے۔

ڈر تو اس کے اندر پہلے بھی گھر کر چکا تھا، جو تشی سے ملنے سے پہلے ہی.....  
کیا وہ واہمہ تھا؟..... وہ سوچنے لگا۔ کیا لوگ میرے بارے میں سچ کہتے تھے؟



بے وقوف - ایسا ہوتا تو بوتلی کی پیشین گوئی سے جو خوشی کی ہر رگ رگ میں اترتی  
چلی گئی، وہ سچ نہوتی - مگر وہ تو سچ تھی - بالکل سچ! ..... رہائی ..... رہائی .....  
بجڑہ کھل جائے گا!

تو کیا نجات کی گھنٹیوں کی وہ آواز ..... واہمہ تھی؟ ..... جسکی تلاش تھی،  
جالتے ہوئے ریگ زاروں میں وہ پگ ڈنڈی ..... محض سراب تھی؟ اس نے تو مسرتوں کو  
اپنے اندر پینچ کر چھپا لیا تھا ..... ندید سے بچے کو کھلو نال جائے تو سب کی نظر بچا کر  
کرتے کے اندر چھپا لیتا ہے - مگر اب کرتے کے اندر برفیل خوف ہے - کیا سرد اندھیرے  
کا سامنا ..... سب کو خوف زدہ کر دیتا ہے؟ ..... اس کا دماغ دکھنے لگا -

شروع کے دنوں میں پلنگ پر لیٹا تو گھر والوں کا خیال گھیر لیتا — بیوی  
بچے ..... بھائی .... رشتہ دار .... اور وہ زیر لب مسکراتا رہتا ..... کون رشتہ دار؟ ....  
کون بیوی، کیسے بچے؟ ..... سب ایک اکائی میں گندھے ہیں ..... میں، فہم میں  
خود سے بچھڑ گیا ہوں - وہ سوچتا، مگر اب ..... تلاش کی منزل آگئی ہے -  
مگر چوتھے دن سے منزل کے قریب آئے اس احساس نے ایک نئے، اجنبی ہول سے  
ہم کنارہ کر دیا - دل پر ایک برف کی سل رکھ دی -

اور پھر یہ برفیل خوف بڑھتا ہی گیا - ہڈیانی روپ دھار لیا اس نے - زن اور وقت  
کا حساب بھی بس سے باہر ہو گیا -

پانچواں دن ..... یا شاید چھٹا دن ہے ..... اسے ٹھیک سے یاد نہیں ہے -  
عجیب بے ہنگم آوازیں کانوں میں آرہی ہیں -

”دو دن سے کچھ نہیں کھایا ہے - ان کو کیا ہو گیا ہے!“

”ڈاکٹر کو کیوں نہیں بتاتے؟“

وہ چیخ پڑتا — نہیں - ڈاکٹر نہیں آئے گا - کچھ نہیں ہوا ہے مجھے .....

ہونے والا ہے - مگر تم نہیں سمجھو گے ..... بے وقوف - خود غرضو .....!

اور اس کا حلق سوکھ جاتا - کانٹے چھیننے لگتے -

”یہ باتیں بڑے بڑے ہیں۔“

کالوں میں رونے کی آوازیں آرہی ہیں ..... ہنادٹی۔ سب بنا دٹی!

اور اب یکایک اسے نگاہ صاف دیکھ رہا ہے۔ صاف سن رہا ہے۔۔۔۔۔  
یہ خود بندہ برس کا لڑکا۔۔۔۔۔ یہ تو میں ہوں۔ میں خود ہوں۔

توبلی میں سرطین عورتوں اور بچوں کی بھیڑ ہے، زرق برق لباس میں! ..... ہاں  
شادی ہو رہی ہے۔۔۔

باہر نوہرے میں بلیوں کو بانس کی ننکی سے گھسی پٹایا جا رہا ہے۔ سینگوں پر  
مالش کی جا رہی ہے۔ رنگ پھیرے جا رہے ہیں۔ رقصیں، ہیلیاں، سب جمع ہیں۔۔۔  
..... نیچے انیٹوں کے فرش پر۔ بارات جائے گی،۔۔۔۔۔ جیور، جمنا پار۔

یہ رتھ چھاکروں نے جمجھائی ہے۔ وہ دلہن کی رتھ، سند رلال بزار نے سجا کر  
بھیجی ہے۔ اور قاضیوں نے۔۔۔۔۔ میوڈن نے۔۔۔۔۔

اور پھر یکایک ہر دھچکڑ میں گڑیڑ ہو گئی۔ فلم کے کئی فریم تیزی سے اوپر نیچے  
دوڑنے لگے۔ کچھ سجھائی نہ دیا۔۔۔۔۔

مگر جلد ہی سب ٹھیک ہو گیا۔ اب جیور سے دلہن بیاہ کر ماموں جان داپس  
پلول جا رہے ہیں۔۔۔۔۔

بارات داپس ہو رہی ہے۔ جیور سے نکلتے ہی جمنا کو رتھوں اور میل گاڑیوں  
نے آسانی سے پار کر لیا۔ اور اب کھاد کے جنگل میں سے گزر رہے ہیں۔۔۔۔۔ سرکٹوں  
کے گنجائی جھنڈوں میں سے۔ یہاں جنگلی سور بہت ہیں۔ اباجی نے بتایا تھا اسے  
اور پہلی میں بیٹھے بیٹھے اسے ڈر لگنے لگا۔ سوردن کا ریوڑ آکر پہلی گرا دے گا،  
اس پر حملہ کر دے گا۔۔۔۔۔ وہ بھیا سے لپٹ گیا ہے۔

”لٹا دو۔ لٹا دو۔۔۔۔۔ دورے کی حالت ہے۔“

دور سے، بہت دور سے آواز آرہی ہے۔ شہد  
کی مکھیوں کی بھنبھناہٹ سی۔۔۔۔۔



جیسے رنگ ایک دوسرے میں پھیل گئے ہیں۔ مل گئے آسمان پر سنہری کرنوں کے بیج زرد گئے۔  
تالاب ابھرنے لگے.....

\_\_\_\_\_ لیکن سارے پرند اڑ گئے تھے۔ بندوق کی آواز کے ساتھ ہی گھنے درخت  
کی پھیلی ہوئی شاخوں میں جو چھپے بیٹھے تھے..... طوطے، ہریل، گلسر، ٹوڑو،  
ہڈ ہڈ اور نیل کنٹھ..... اور ناخائیں۔ سب ہی اڑ گئے تھے۔ اور وہ بہت  
دیر تک ان کی قطاریں آسمان میں دیکھتا رہا..... اور پھر وہ زرد دل دل  
میں غائب ہوتے گئے۔

اور پھر ایک بڑے دھماکے کے ساتھ وہ قد آور پیڑ گر گیا۔ جڑیں زمین کے باہر  
منہ اٹھائے چت پڑی تھیں۔ \_\_\_\_\_

اتنا پرانا اور گھنا درخت کیسے گر گیا! وہ اسے بچپن سے دیکھتا آیا تھا۔  
..... اور وہ یوں بے جان ہو کر اس کی بے بس نظروں کے سامنے گر گیا! ..... وہ  
بے چین ہو کر چیخنے لگا \_\_\_\_\_ اسے گرنے مت دو..... اس کے پرندوں کو واپس  
بلاؤ۔ سنتے نہیں ہو؟۔۔۔۔۔ بزدلو،..... بے وقوف؟۔

اس کی چیخوں میں چھتے والی مکھیوں کی جھن بھناہٹ بھی ابھرتی رہی، چمکیاں اور  
دبیز سانسوں کی آوازیں بھی۔

\_\_\_\_\_ پھر وہ بے ہوش ہو گیا۔ بے ہوش پڑا رہا..... جانے کب تک۔

جب ہوش آیا تو ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا۔ میز پر کیلنڈر دیکھا.....

ساتواں دن!..... آخری دن..... نجات کا دن؟

تم بچ نہیں سکتے۔ اُس کا کہا ہوا کبھی غلط نہیں ہوا۔ اس کے دوست نے کہا تھا۔  
وہ یکایک اٹھ کر کھڑا ہو گیا.... ابھی کھڑا ہو سکتا تھا! اس نے حیرانی سے اپنے آپ کو دیکھا۔  
دروازے سے باہر نکل گیا.... ابھی چل سکتا تھا!

اور پھر ادھڑی ہوئی شرک پر دوڑنے لگا.... ابھی دوڑ بھی سکتا تھا!

\_\_\_\_\_ بھاگ جا..... بھاگ جا.....

— کہاں جا رہا ہے؟ ..... کیا بھاگ کر جاسکتا ہے؟ ہر طرف ننگی تلواریں  
لٹک رہی ہیں..... اور دل پر برف کی بھاری سُل ہے۔

یہ ایک اس کے قدم رک گئے.... اُدھڑی ہوئی سڑک اس کے پیروں سے  
چٹ گئی۔ سامنے سے ارتھی آرہی تھی۔ تھوڑے سے آدمی، کھوٹے کھوٹے سے.....  
گردن جھکاتے پیچھے پیچھے آ رہے تھے..... رام نام ست ہے۔  
وہ جہاں کا تھاں کھڑا رہ گیا۔ سرد نکیلی لہر اوپر سے نیچے تک چیرتی چلی گئی  
— رام نام ستیہ ہے۔

اور پھر سرد پسینہ۔ سارے جسم پر برف کے قطرے چوٹوں کی طرح ریٹکنے لگے.....  
— مگر یہ کیسے ہو سکتا ہے.... میں تو یہاں کھڑا ہوں؟  
— بے وقوف؟ لوگ تجھے دیکھ بھی رہے ہیں۔ تو نظر آ رہا ہے۔  
..... تیری گھگھی کیوں بندھ گئی ہے؟

”کون..... کون مر گیا ہے؟..... آج تو مرنے والا.....“  
”تم جانتے تھے اسے؟“

جواب کا انتظار کئے بغیر وہ آگے بڑھ گئے۔ اور وہ لڑکھڑا کر گر پڑا، درخت  
کے نیچے۔

ایک لخت کسی شاخ پر سے ایک بُرا سا پرندہ پھڑپھڑا کر اڑ گیا.....  
ہر طرف موجوں کا، میجان بکھیر کر۔

اور ان موجوں میں برف کے ریٹکنے والے قطرے اس کے جسم پر تحلیل  
ہونے لگے۔ وہ سائے میں لیٹ گیا۔ شاخوں کے جھرونگوں میں سے اس کی  
نظریں آسمان کی طرف اٹھ گئیں۔

دہاں گدلی زرد دل دل مسکرا رہی تھی۔

▲▲

## نیم کا پیڑ

باہر گلی میں کتے بہت زور زور سے بھونک رہے تھے جس سے بنسی کی آنکھ کھل گئی۔ دل ہی دل میں ان کو برا بھلا کہتے ہوئے اس نے کروٹ بدلی تو بانس کی پرانی چار پائی چر چرا اٹھی۔ لیٹے لیٹے ٹانگوں سے کھلی باؤں پر کھیس کو اچھی طرح پھیلا کر وہ پھر سونے کی کوشش کرنے لگا مگر رات کے گہرے سناٹے میں کتوں کی چیخیں کانوں میں بچھڑی جا رہی تھیں۔ کہیں دور چوکیدار چلا رہا تھا۔ ہوشیار، خبردار، اور پھر اپیل کی سگتی ہوئی رات! اور نیم کی شاخیں سر نیوڑھائے چپ چاپ کھڑی تھیں۔ کہیں ایک پتہ بھی ہلتا نظر نہیں آ رہا تھا۔ بنسی کو وحشت مہی ہونے لگی۔ آنکھیں کھول کر وہ نیم کی شاخوں کے جال میں سے ستاروں کو دیکھنے لگا..... دو یا ڈھائی بجے ہوں گے، اس نے اندازہ لگایا۔

جو کیس دھمکی آواز اب قریب آگئی تھی۔ گلی میں اینٹوں کے فرش پر اس کی لاٹھی کی ٹھک ٹھک کتوں کی چیخوں کے ساتھ اب صاف سنائی دے رہی تھی۔ چار پائی پر لیٹے لیٹے گردن کو ذرا سا موڑ کر اس نے آہستہ سے پکارا۔

”منگلو..... منگلو رے! اٹھ بیٹھ ذرا“ — اور پاس ہی اندھیرے

میں ایک اور چار پائی چر چرائی۔

”کیا ہے بالو؟“ منگلو، بنسی کا بیٹا نیند بھری آواز میں بڑبڑایا۔

”کتے بڑی دیر سے بھونک رہے ہیں۔ جانے کیا بات ہے.... ذرا ہوشیار ہو“  
”یکھ نہیں بالو“ بھلا یہاں کون پورا آ سکتا ہے!..... یہ کتے حرام زادے

تو روز ہی چلا تے ہیں" اور کروٹ بدل کر منگلو پھر سو گیا۔

بنسی چُپ ہو گیا۔ ٹھا کر روپ سنگھ کی حویلی میں سچ سج آج تک کسی جیالے

کو چوری کرنے کی ہمت نہیں ہوئی تھی۔ یہ اور بات ہے کہ ان کے یہاں چوروں کا آنا جاننا دن رات لگا رہتا تھا۔ مگر وہ آتے آتے تھے صلاح مشورے کرنے۔ چوریوں کی نئی نئی اسکیمیں بنانے۔

یا پھر چراگئے ہوئے مال کا ہٹوارہ کرنے۔ ٹھا کر صاحب ان کے سرغنہ تھے۔ بڑے بڑے

نامی چور اور ڈاکو ان کے اشارے پر چلتے اور ان کے بنائے ہوئے طریقوں سے دُور دُور

تک بچھاپے مارتے۔ سینکڑوں ہزاروں کے وارے تیارے ہو جاتے۔ سارا علاقہ ٹھاٹھ

صاحب کے نام سے کانپتا تھا۔ مائیں اپنے بچوں کو ڈرانے کے لئے ان کا نام لیا کرتی تھیں

\_\_\_\_\_ مگر یہ سب بیتے دنوں کی باتیں تھیں۔ اب وہ بات جاتی رہی تھی۔ بنسی کے

دیکھتے دیکھتے ٹھاٹھ صاحب کا سارا رُعب داب ساری آن بان ختم ہو گئی تھی۔ اب نہ ان کا

وہ کاروبار باقی رہا تھا، اور نہ وہ پہلی سی آمدنی، اور نہ وہ پہلی سی دن رات کی محفل آرائیاں!

اب تو ان کی تجوری تک قصبے کے کسی بھی منچلے نوجوان کا ہاتھ باسنی پہنچ سکتا تھا۔

حویلی کے پچھڑے حصے سے ملا ہوا ٹھاٹھ صاحب کا نوہرہ تھا۔ جہاں ان کے مولشی

بندھتے تھے۔ اور قصبے کے سب سے بڑے رئیس ہونے کے ناتے ان کے یہاں مولشی بھی

سب سے زیادہ تھے۔ رات کو جب وہ برابر برابر کھڑکھڑکھٹوں سے بندھتے تو نوہرہ کا وسیع احاطہ

ان سے بھر جاتا۔ ایک طرف کرنے میں ڈربوں کے اندر مرغیاں اور بلیاں بندھتی تھیں۔ ان

کے آگے بکریاں اور بھٹیڑیں باندھی جاتیں۔ اور ان کے بعد دیوار سے ملی ہوئی الاؤنڈیوں کے

مقابل بھینسیں لگائیں اور بیل ہوتے تھے۔ وسیع احاطے کے درمیان نیم کے پیڑ کے ساتھ

ایک لالٹین لٹکا دی جاتی جس کی میلی میلی روشنی سیاہ راتوں میں کوئی کام نہ دے سکتی۔

بنسی کا کام مویشیوں کی دیکھ بھال کرنا تھا۔ اس کی ساری عمر بیلوں اور بھینسوں کو

کھریہ کرتے یا ان کو کھوکھلے بانس میں گڑا اور تیل پلاتے گزاری تھی۔۔۔۔۔۔ رات کو

وہ سوتا بھی ان ہی کے پاس تھا کسی زمانے میں اس کے برابر اس کے باپ کی چار بائی ہوتی

تھی۔ مگر اب وہاں اس کا بیٹا منگلو سوتا تھا۔ وہ تو اب ٹھاٹھ کے مویشیوں کی تعداد

گھٹ گئی تھی۔ درنہ ہنسی کے سچپن میں ان کے درمیان رات کو دو چار پائیوں کی جگہ نکلتا بھی دشوار ہو جاتا تھا۔

بہنسی کو جب یقین ہو گیا کہ اب دیر تک نیند نہ آ سکے گی تو اٹھ کر بیٹھ گیا۔  
 پھوکیدار کی لالٹھی کی ٹھٹھک اور کتوں کی پیچھے پکار رات کی بُرا سراسر تاریکیوں میں جذب  
 ہو چکی تھی۔ اور اب ہر طرف گہرا سناٹا پھایا ہوا تھا۔ صرف کبھی کبھی نیم کے پرے سے  
 پتو پاریں کے جھکالی کرنے کی آوازیں سُنائی دے جاتی تھیں۔ جیسے کوئی سرو تے سے چھالیا  
 کستر رہا ہو۔

آہستہ آہستہ قدم دھرتا بنسی مویشیوں کے پاس چلا آیا۔ اس کے قدموں کی آہٹ پا کر وہ ایک لمحے کے لئے ٹھٹک جاتے۔ گردن موڑ کر اس کی طرف دیکھنے لگتے، اور پھر جنگلی میں مصروف ہو جاتے، ان کے آگے دھرم ہوتی نازیں اور پرانتیں چارے سے خالی ہو چکی تھیں۔ پھر بھی گو برادر مینگنیوں کی مخصوص روکے ساتھ ساتھ نوہرے میں ابھی تک کھلتی اور بھرے کی بو بھی پھیلی ہوئی تھی۔ پچھلے بنسی کے چمیتے اور قیمتی سیلوں کی جوڑی بندھی تھی۔ جانے پہچانے قدموں کی چاپ سن کر وہ دونوں بدن سمجھک کر اُٹھ کھڑے ہوئے۔ اور خالی الاڈی میں منہ سے ”فون فون“ کر کے بھر دسہ اڑانے لگے۔ بنسی نے بڑے پیار سے انہیں پختہ کیا۔۔۔۔۔۔ یہ چوپائے اس کی زندگی تھے اور چادو سے وہ انہیں اسی طرح پختہ کرتا جس طرح کسی زمین میں وہ منگلو کو توپیک تھیک کر سلا یا کرتا تھا۔

واپس اپنی چار پائی پر جانے کی بجائے بنسی حویلی کے صحن کی طرف نکل گیا۔ حویلی کا لمبا چوڑا صحن رات کی تاریکی میں اور بھی زیادہ وسیع معلوم ہو رہا تھا۔ بائیں طرف دالان کے بازو دو منزلہ کوٹھا تھا جو زنان خانہ کے طور پر استعمال ہوتا تھا۔ مگر گرمیوں میں سب لوگ اوپر جو بارے پر سوتے تھے۔ کمرٹھے کے آگے پختہ دالان کے سرے پر ایک خوب صورت سیاہ بارہ دری تھی۔ جو ٹھا کر صاحب کی بیٹھک کے نام سے مشہور تھی۔ اس کا اصل دروازہ باہر گلی کے فرش پر کھلتا تھا۔ ٹھا کر صاحب کی پچاس سالہ زندگی کے بیشتر لمحہ۔ اسی بیٹھک میں گزرے تھے۔ اور اس کے ساتھ بڑی حسین یادیں وابستہ تھیں۔ بیٹھک میں ہمیشہ



تو اس میں میرے اتنے پریشان ہونے کی کوئی بات ہے!، میں سوچنے لگا۔

لیکن پھر بھی میڈم کے فلیٹ میں داخل ہوتے وقت میرا دل بری طرح دھڑک رہا تھا۔ میڈم کے یہاں ہر چیز حسب معمول تھی۔ کہیں بھی کوئی غیر معمولی بات نظر نہیں آئی۔ اپنی اور وہ میز پر جھکے ہوئے کسی میگزین میں تصویریں دیکھ رہے تھے۔ اپنی کے چہرے سے کوئی خاص بات نمایاں نہیں تھی اس کے کپڑے، بالوں کی سجاوٹ، اس کا سراپا.... سب کچھ ویسا ہی تھا، جو ہمیشہ ہوا کرتا تھا! ہونٹوں کے کناروں پر ہلکی سی مسکراہٹ بھی ویسی دلکش، ویسی معصوم تھی! کہیں بھی، کوئی ذرا سا بھی تغیر ڈھونڈے سے نہیں ملتا تھا۔ میڈم کی آنکھوں میں بھی وہی پیارا، وہی خلوص تھا جو ہمیشہ اپنی کی موجودگی میں پیدا ہو جاتا تھا۔ مجھے دیکھ کر وہ ہولے سے مسکادی۔ اور اپنی ہمیشہ کی طرح چہک کر برلی۔ "ہلو رشید صاحب!"

اور اب ہر بات میری سمجھ میں آتی جا رہی تھی۔ ذہن پر سے وہ سارا بار، اعصابی تناؤ اترتا جا رہا تھا جو اتنی دیر سے مسلط تھا۔ مجھے ایک گونہ سکون محسوس ہوا۔!

میڈم کے فلیٹ میں آج بھی ہر چیز ویسی ہی تھی۔ کچھ بھی تو نہیں بدلا تھا! اب یہاں کی کوئی چیز نہیں بدلے گی۔ یہ ماحول، یہ کمرہ، یہ دن، یہ راتیں، میڈم، اور میڈم کی بیماری، نفیسی، بچی، اپنی یہ سب ویسے ہی رہیں گے۔ اس کے کمرے کے اندر نہ تو وقت آگے بڑھے گا۔ اور نہ زمانہ ناسطے طے کرے گا۔ باہر سینکڑوں تغیرات ہوں گے۔ نئے نئے واقعات اور حادثات رونما ہوں گے، دنیا آگے بڑھے گی اور زندگی منازل طے کرے گی۔ لیکن یہاں کچھ نہ ہوگا! وقت یہاں کسی میز کے نیچے، دُک کر سویا پڑا رہے گا۔۔۔۔۔ میڈم وہی رہے گی۔ اپنی وہی رہے گی اس نے کہا تھا نا.... میں نے سوچ لیا ہے۔ آپ فکر نہ کریں۔؟"

اور پھر ہم لوگ برج کھیلنے لگے۔ چائے آئی۔ باتیں ہوئیں۔ وقت اسی طرح گزر گیا جیسے پہلے ہمیشہ گزرا کرتا تھا۔ میڈم خوش تھی اپنی خوش تھی اور جب میں جلنے لگا تو اپنی نند لافظ کہنے دروانے تک بھٹی آئی۔ اسکی مسکراہٹ آج ہمیشہ سے زیادہ خوبصورت معلوم ہو رہی تھی۔ "آج رات میں یہیں میڈم کے ساتھ رہوں گی۔" اس نے آہستہ سے کہا۔ ▲▲

بنسی نے سوچا کہ شاید بالوکنج بہاری شہر سے واپس آگئے ہیں۔

حویلی کے وسیع صحن میں نوہرے کی چھوٹی سی دیوار کے ساتھ ایک کچا چوترہ بنا ہوا تھا۔ اس پر کسی زمانے میں تلسی کا بیڑ تھا۔ لیکن آج کل وہاں پیڑ کی بجائے گوبر کے دو چار اپلے پڑے دیکھتے رہتے تاکہ دقت بے دقت ٹھا کر کے خوبصورت مراد آبادی حقے کو گرم رکھا جاسکے۔ بنسی چوترے پر ان اپلوں کے پاس ہی بیٹھ گیا۔ اس کی چلم بھی پاس ہی دیوار سے لگی دھری رہتی تھی۔ اور تمباکو کا انٹا ہمیشہ پگڑی کی تہوں میں اڑسا موجود رہتا۔ اپلوں پر سے راکھ پھونک کر اس نے چلم بھری اور ایک لمبا کش لے کر دیوار کے سہارے آرام سے بیٹھ گیا۔ اس رات اس کے ذہن میں بیتے دنوں کی بہت سی یادیں جاگ رہی تھیں۔۔۔۔۔

وہ اسی حویلی میں پیدا ہوا تھا۔ اس کا باپ بڑے ٹھا کر کا پڑانا نمک خوار تھا۔ ان دنوں بڑے ٹھا کر کے پاس نہ یہ لمبی چوڑی حویلی تھی، اور نہ اتنی بڑی زمین جائیداد۔ یہ سب تو انہیں بھگوان نے اپنی کرپا سے پھیر پھاڑ کر ایک ہی دن میں بخش دیا تھا! اس ستاون کے غدر میں انہوں نے دوانگریز افسروں کی جان بچائی تھی۔ بس پھر کیا تھا! انہیں دتی بلا کر انعام و اکرام سے سرفراز کیا۔ بہادری اور وفاداری کی سند عطا کی گئی۔ اور سب سے بڑھ کر یہ کہ ایک گاؤں اور پانچ سو بیگھے زمین ان کے نام لکھ دی گئی۔ ٹھا کر رنجیت سنگھ ایک ہی جہت میں غلطی کے سب سے بڑے زمیندار بن گئے۔ راتوں رات ان کے پُرانے کچے گھر وندے کی جگہ یہ شان دار حویلی اٹھ کھڑی ہوئی۔ گاؤں کی رعیت چوبیس گھنٹے آگے پیچھے خدمت میں لگی رہتی۔ جائیداد کی دیکھ بھال اور لگان کی وصولی کے لئے منیم رکھے گئے۔ بنسی نے اپنے باپ سے سنا تھا کہ جب بڑے ٹھا کر سورج بامش ہوئے تو پھوٹے ٹھا کر کے لئے خزانے میں ڈیڑھ لاکھ روپیہ نقد چھوڑ گئے تھے۔

جوئے کی لت ٹھا کر روپ سنگھ کو بچپن سے تھی۔ اب جوئے ڈھیر سی دولت ہاتھ لگی تو جوئے کے ڈھنگ بھی بدل گئے۔ شہر پر مکھیوں کی طرح ان کے یار دوست بھی منڈ لگتے ہوئے آجھ ہوئے۔ کسی نے مشورہ دیا کہ بمبئی اور پونا کی ریسوں کی بات ہی اور ہے!

پھر کیا تھا۔ ٹھاکر صاحب ساری پونجی ایک ہی سیزن میں ہار بیٹھے۔ لٹڈے منڈے واپس آئے تو روپیہ پیدا کرنے کی نئی نئی تدبیریں سوچنے لگے جائیداد کی مستقل آمدنی ان کے شوق پورا کرنے کے لئے قطعی ناکافی تھی..... چنانچہ ان کے ذہین دماغ نے روپیہ پیدا کرنے کی ایک بڑی آسان اور موثر ترکیب ڈھونڈ نکالی۔۔۔۔۔ چھریاں اور ڈاکے! ان کے مخبر سارے علاقے میں گھوم پھر کر مقامات اور موقعوں کی نشان دہی کرتے۔ ٹھاکر صاحب کی سرکردگی میں اسکیمیں بنتیں۔ نقب لگتے۔ مسلح حملے کئے جلتے اور گھنٹوں اور روپوں پیسوں سے لدی قلعیاں ان کی بیٹھک میں پہنچ جاتیں۔ یا پھر راتوں رات ایک گھاؤں کے مولیشی دوسرے گھاؤں پہنچ جاتے۔ سودا ہوتا اور نقدی ٹھاکر صاحب کی خدمت میں حاضر کر دی جاتی۔ بٹوارہ ہوتا اور سردار کا حصہ ٹھاکر صاحب کو ملتا۔ کہیں کوئی گڑ بڑ یا ادب پنچ ہو جاتی تو تھانیداروں کے منہ اپنی کو بند کرنے پڑتے۔ کبھی کبھی قتل و خون کی واردات بھی ہو جاتی ایسے موقعوں پر تھانیداروں کی بن آتی..... لیکن بہر حال یہ کاروبار بڑا کارگر اور نفع بخش ثابت ہوا۔ سارے علاقے پر ٹھاکر کی دھماک بیٹھ گئی۔ لوگ بطور تادان بھاری رقیب نذر کرنے لگے۔ ٹھاکر کو جو آمدنی زمینوں سے عمر بھر نصیب نہ ہوتی وہ اتنی گھر بیٹھے ان طریقوں سے بڑھنے لگی!

بہنسی کو ایک عرصے تک ٹھاکر کی ان مصروفیات کا علم نہ ہو سکا تھا۔ اس کی دنیا تو بس مویشیوں سے کمیوں تک محدود تھی۔ حویلی میں نوکروں کی کمی نہ تھی۔ پھر بھی اپنے مویشیوں کی دیکھ بھال وہ خود ہی کرتا۔ اور دن رات اپنے کاموں میں مشغول رہتا۔ پہلے پہل ٹھاکر کے اس انوکھے کاروبار کی افواہیں اس کے کانوں تک پہنچیں تو اسے یقین نہ آ سکا۔ مگر دھیرے دھیرے ہر بات اس کا سمجھ میں آتی چلی گئی۔ آخر اس نے بھی دنیا دیکھی تھی۔ اور اب تو اس کی کنپٹیوں پر سے بال بھی سفید ہونے لگے تھے۔۔۔۔۔ اس رات چوتھے کی دھڑلے کے سہارے بیٹھے بیٹھے جب اس نے ان باتوں کو یاد کیا تو ایسے محسوس ہوا جیسے یہ سب حقیقت نہیں خواب تھا۔۔۔۔۔۔۔

شراب اور جوئے کے ساتھ ساتھ نایاب رنگ کی محفلیں بھی شروع ہو چکی تھیں۔

ٹھکرائی ترخیر شادی کے تیسرے برس ہی کچھ اولاد نہ ہونے کے غم میں اور کچھ ٹھاکر کے شغل کے غم میں بھگوان کو پیاری ہو گئیں۔ مگر ٹھاکر کی بیٹھک میں آئے دن طوائفوں کا تانتا بدستور بندھا رہا آج میرٹھ سے طائفہ آیا ہے تو کل بلند شہر سے پرسوں دلی سے پانڈا آرہی ہے تو ترسوں خمد جس سے ..... بھرا ہوا ہے، یاد درست داد دے رہے ہیں۔ شراب پانی بنی ہوئی ہے ..... اور پھر ٹھاکر کیلئے کے نیچے سے تاش کی گڈی نکالتے ایک ایک بل ہزار دو ہزار تک جا پہنچتا۔ کسی کے پاس رتم ختم ہو جاتی تو ٹھاکر ادھا دیدیتے۔ جس کی وصولی کی نوبت کبھی نہ آتی۔ دن رات یوں گزر جاتے جیسے شزرغ ہی نہیں ہوئے تھے۔

اور پھر بنسی کو وہ دن بھی یاد آیا جب کسی نے آکر ٹھاکر کی بیٹھک میں خبری تھی کہ آزادی آگئی! بڑی دیر بعد ٹھاکر کی کچھ میں آیا تھا کہ آزادی سے مراد انگریزوں کی غلامی سے نجات ہے۔ بڑی متانت سے مسکرا کر انہوں نے کہا تھا — ”ہونہہ ہمیں کیا۔ کوئی آئے، کوئی جائے!.....“ لوگ اس آزادی پر خوش ہیں تو کوئی اچھی ہی بات ہوگی“ — لیکن دل میں ٹھاکر کو انگریزوں کے چلے جانے کا ملال ضرور ہوا تھا۔ وہ ان کی شرافت اور سخاوت کے بے حد معترف تھے۔ وہ نہ ہوتے تو بڑے ٹھاکر کو اتنی ساری جانی داد کون دے دیتا۔!

آزادی کے ساتھ ہی فساد اٹھ کھڑے ہوئے لوٹ مار کا بازار گرم ہو گیا۔ مسلمان گاوؤں بھوڑ بھوڑ کر جلنے لگے تو ٹھاکر اور ان کے پیلوں کے لئے ایک اور راستہ کھل گیا۔ لوٹ کا مال تو الگ رہا۔ بھانگے والوں کی جائیداد اور مال و سیلاب کوڑیوں کے دام بک رہے تھے ٹھاکر کا خزانہ بڑی تیزی سے بھرنے لگا۔ ساتھ ہی ساتھ آزادی کی خوشی میں ان کی مفلوں کی ہنگامہ آرائیاں بھی دوبالا ہو گئیں۔

لیکن جلد ہی انہیں محسوس ہونے لگا کہ یہ آزادی بہت ہنگامی پڑی ہے۔ لوگوں میں انقلاب کے نام سے ایک عجیب ہل چل سہی پیدا ہو گئی تھی۔ ان کی رعایا دن بدن گستاخ اور نافرمان ہوتی جا رہی تھی جو آنکھیں ان کے آگے زمین سے اوپر نہ اٹھتی تھیں،

اب ان میں نفرت اور غصے کے رنگ بھلک رہے تھے۔ مقررہ لگان سے ایک پائی بھی بڑھ کر وصول کرنا ان کے منیموں کے بس سے باہر ہو گیا تھا اور پھر سب سے بڑھ کر تو یہ کہ چوریوں اور ڈاکوں سے ہونے والی آمدنی گھٹ کر صفر ہو گئی تھی!

\_\_\_\_\_ ٹھاکر کا سارا رعب دیکھتے ہی دیکھتے ختم ہو گیا۔ علاقے میں ان کا نام تو پہلے ہی سے بدنام تھا۔ اب لوگ کھلے بندوں ان کی اور ان کے چیلوں کی نشان دہی پولیس میں کرنے لگے۔ اور پولیس کے یہ نئے نئے فوجوان اسر ٹھاکر کے بس میں بڑی مشکل سے آتے تھے ان کے پیچھے بھی انہوں نے بڑی بڑی رقمیں صرف کیں، رشوتیں دیں، لیکن یہ لوگ بڑے بے وقوف اور بزدل ثابت ہوئے۔ واقعات کی عمدگی سے ”سترپشی“ کرنا انہیں آتا ہی نہ تھا۔ یا پھر شہیدان پر بھی عوام کا ڈر سوار ہو گیا تھا۔۔۔۔۔ نتیجہ یہ کہ ٹھاکر کے آدمی دھڑا دھڑا دھڑلے لگے۔ خود ٹھاکر کو کئی بار عدالت کی سیڑھیاں چڑھنی پڑیں۔ قتل کے ایک کیس میں تو ان کی جان بال بال بچ گئی۔ خزانے کا منہ کھول دیا، تب کہیں جا کر بات دب سکی۔!

ٹھاکر کے پُرانے دوست بابو کنج بہاری نے کئی بار سمجھانے کی کوشش بھی کی۔ لیکن ٹھاکر صاحب نے اپنے میل و نہار بدلنے سے صاف انکار کر دیا۔

”ٹھاکر جی، وقت کے دھاروں کو کوئی نہیں بدل سکتا۔ ذرا چونکیے..... اپنے ارد گرد دیکھیے دنیا کہاں سے کہاں پہنچ گئی ہے! آپ کو بھی اپنے رنگ ڈھنگ بدلنے ہوں گے ورنہ.....“ بابو صاحب کہتے کہتے رک جاتے۔

”ورنہ کیا؟“ ٹھاکر غصے سے چیخ اٹھتے۔

”آپ تباہ ہو جائیں گے“ بالآخر بابو صاحب کہہ اٹھتے ”نام و نشان تک باقی

نہ رہے گا..... زمانے سے ٹکر لینے کا یہی انجام ہوتا ہے۔“

”مگر میں زمانے سے نہیں ڈرتا..... میں کسی سے نہیں ڈرتا“ ٹھاکر کی آنکھوں سے شعلے پلکنے لگتے۔ بابو کنج بہاری مسکرا پڑتے۔ ”ٹھاکر جی۔ آخر کب تک یہ نادر شاہی مزاج، یہ زالی ٹھاٹھ چل سکے گا۔؟“

”چلے گا“ ٹھاکر کا بوڑھا جسم کانپنے لگا۔ ”ٹھاکر روپ سنگھ نے آج تک

کسی سے ہار نہیں مانی۔“

”ہار تو ہو بھی چکی ٹھاکر“ بالو صاحب کہتے ”آپ کے خزانے میں اب کیا رہا ہے ! .... اور جب سب کے ساتھ آپ کی جاگیر بھی حکومت کے ہاتھوں میں چلی جائے گی، تب کیا کریں گے آپ؟“

جواب دینے کی بجائے ٹھاکر چپ ہو جاتے۔ کبھی کبھی تو انہیں بھی محسوس ہوتا جیسے قدموں کے نیچے سے زمین سرکتی جا رہی ہے۔ اوردہ کلپنتے ہوئے ہاتھوں سے کسی کو مضبوطی سے تھام لیتے۔ ان کے مرجھائے ہوئے چہرے پر زردی چھا جاتی۔ جیسے کوئی خزانہ رسیدہ پودا۔ بنسی انہیں اس حالت میں دیکھتا تو کلیجہ منہ کو آنے لگتا۔ اس کے دل میں ٹھاکر کی محبت کم نہ ہوئی تھی۔

ٹھاکر نے ہار نہیں مانی۔ اگرچہ ان کی زندہ دلی اب جھلکا ہٹ اور پڑ پڑے پن میں تبدیل ہو چکی تھی۔ لوگ ان کے سائے سے کترانے لگے تھے۔ پرانے یار دوست ساتھ چھوڑ بیٹھے تھے۔ ٹھاکر کی دوستی ننگ عزت سمجھی جانے لگی تھی۔ صرف چند موقع پرست تھے جو بھاگتے چور کی لنگوٹی بھی چھوڑنے کے قائل نہ تھے۔ اور جنک کی طرح ان سے پچھے ہوئے تھے۔ آمدنی کے ذرائع بند ہو جانے پر بھی ٹھاکر کی رات کی فعلیں بدستور زندہ تھیں۔ طائفے آنے بند ہو گئے تھے۔ لیکن شراب اور جوئے کو چھوڑنا ان کے بس میں نہیں تھا۔ جلی ہوئی رستی کے لمز تے بل، ہوا کے ایک تند جھونکے کے منتظر تھے جو ان کو بھی اڑا لے جائے۔

رات کے پچھلے پہر کی خوش گوار نمی فضا میں تحلیل ہونے لگی تھی۔ ہوا کے ہلکے ہلکے لطیف جھونکے بھی تھوڑی تھوڑی دیر سے سرسرا اٹھتے۔ بنسی کو بڑا سکون سا محسوس ہو رہا تھا۔ لیکن نیند آنے کے اب بھی کوئی آثار نہ تھے۔ نہ جانے کیوں اس کا ذہن سوچوں کے دلدل میں پھنس کر رہ گیا تھا.....

حوالی کا یہ وسیع صحن جواب خالی پڑا بھائیں بھائیں کر رہا تھا کسی زمانے میں نوکردوں اور بیکاروں کی چار پائیوں سے یوں بھر جاتا تھا جیسے مرغیوں سے ڈربہ۔ مگر آج

وہاں ایک بھی چارپائی نہ تھی، سارے نوکر حویلی سے اس طرح غائب ہو گئے تھے جیسے سورج کے ڈھلنے ہی سائے !.....

ایک دن تو منگلو بھی کہہ اٹھا تھا :-

” بالو، تم کب تک ٹکے رہو گے؟ \_\_\_\_\_ ایسے پانی کا تو پانی بھی حرام ہے۔“ لیکن یہ منی منی کی آنکھوں میں آنسو آگئے تھے، اس نے کہا تھا۔  
 ” نہیں بیٹا۔ ہم نے ٹھاکر کا نمک کھایا ہے۔ ہمارے پڑکھوں نے اسی حویلی میں دم توڑا ہے۔ ..... ٹھاکر کے دن پھر گئے ہیں تو کیا ہم بھی اپنا خون سفید کر لیں؟“

دراصل منی کی رگوں میں دوڑنے والا بوڑھا خون اپنی ساری حرارت کھو چکا تھا۔ ایسی بات وہ اب سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔ یا پھر شاید اس کی وجہ ٹھاکر کے مولیٰ شی تھے جنہیں منی نے اپنا خون پسینہ ایک کر کے پالا تھا۔ جن سے وہ منگلو جیسا پیار کرتا تھا۔ اور جن کی جڈائی کا تصور بھی اسے بے چکین کر دیتا تھا۔  
 \_\_\_\_\_ منی نے آخری کش لے کر جلم کو بچو ترے پر ادندھا دیا۔ ٹھاکر کی بیٹھک میں روشنی ابھی تک باقی تھی۔ وہ سوچنے لگا بالو کینج بہاری کھی دن بعد آئے ہیں۔ ادھر تین دن سے ٹھاکر نے تاش کی گڈی کو ہاتھ بھی نہیں لگایا تھا۔ کوئی آیا ہی نہ تھا جس کے ساتھ کھیل سکتے۔ ماہی بے آب کی طرح ٹرپ ٹرپ کر انہوں نے یہ دن گزارے تھے۔ رات کو سوتے تو تاش کی گڈی سر ہانے رکھ لیتے۔ ..... اتنا بڑا تغصہ ان کے کھیل میں پہلے کبھی نہیں پڑا تھا۔ آج موقع ملا ہے۔ ساری کسر نکالے بغیر بالو صاحب کو واپس نہ جانے دیں گے !

اور اب ہوا کے پھونکنے تیز ہو چکے تھے۔ آہستہ آہستہ ان کی تیزی بڑھتی ہی جا رہی تھی۔ یوں لگتا تھا جیسے صبح تک تندائے ہی شروع ہو جائے گی۔ پرانے نیم کی شاخیں کھوکھلے تنے پر دوہری ہوئی جا رہی تھیں۔ انکی شاخیں تاش کی آواز نے رات کے اندھیرے کو اور خونک بنا دیا تھا۔ نیم کا یہ پیڑ ٹھاکر کے مزاج کی طرح بوڑھا ہو چکا تھا۔ اور منی نے

کئی بار سوچا تھا کہ اسے گرا دینا ہی بہتر ہے۔ ورنہ ایک دن کسی زور کی آندھی میں وہ خود نہیں کے پھیر پر ڈھیر ہو جائے گا۔..... اور اس کے ساتھ ہی اسے اپنے بیلوں کا خیال آگیا۔ رات تھوڑی رہ گئی تھی اور اب چل کر سو جانا چاہیے۔ اس لئے سوچا۔

لیکن اسی لمحے ٹھاکر کی بیٹھک کا دروازہ کھلنے کی آواز پر وہ چونک پڑا۔ نظریں اٹھا کر اس نے سامنے صحن کی دوسری جانب دیکھا۔ بیٹھک کے کھلے دروازے سے روشنی کی ایک سفید چادر پھوٹ رہی تھی۔ اور اس چادر میں نہاتے ہوئے ٹھاکر صاحب کھڑے تھے۔ ان کے ہاتھ میں مراد آبادی حقے کی خوب صورت چلم تھی۔ جس پر جمالی دار سر پوش ڈھکا تھا۔ اتنی دُور سے بھی بنسی کو ان کے جسم کے تحدخال اچھی طرح نظر آرہے تھے۔..... کسی زمانے میں ٹھاکر اپنے کوتاہ قد کے باوجود بڑے وجیہ آدمی سمجھے جاتے تھے۔ چوڑا چکلا سینہ، بھرے بھرے ہاتھ پیر اور تیز روشن آنکھیں..... لیکن ادھر کچھ دنوں سے نئی نئی فکر دن نے جسم کا سارا رس پخوڑ لیا تھا! قتل کے مقدمے کے بعد تو ان کے چہرے کی رونق جیسے ہمیشہ کے لئے غائب ہو گئی تھی جسم پر جگہ جگہ بڑیاں ابھرائی تھیں اور چہرے کی چمک دار چکنی جلد پر بھریوں کی لکیریں نمودار ہونے لگی تھیں۔ شاید عمر میں پہلی بار انہیں نحس ہوا تھا کہ وہ بوڑھے ہو چکے ہیں!

دور سے روشنی میں ٹھاکر کا ستا ہوا زرد چہرہ عجیب بھیانک سالک رہا تھا۔ جیسے آخری پہر کا چاند ڈوبتے ڈوبتے کھنڈروں کے پرے کسی ٹھنڈے میں اٹک کر رہ گیا ہو۔..... اور پھر لڑکھڑاتے قدموں سے وہ بنسی کی طرف بڑھنے لگے۔ ان کے ہاتھ میں چلم بُری طرح لرز رہی تھی۔ بنسی نے ٹھاکر کو اس حالت میں دیکھا تو دل بھر آیا۔ کبھی ٹھاکر روپ سنگھ کو اپنا حقہ بھرنے خود ہی آنا پڑے گا، یہ اس نے سوچا بھی نہ تھا۔ دوڑ کر وہ ان کے پاس گیا اور ہاتھ سے چلم لے لی۔ ٹھاکر اسے دیکھ کر یوں چونکے جیسے اچانک پوری کرتے پکڑ لیے گئے ہوں!

”کون؟ بنسی.....!“ رندھی ہوئی آواز میں بولے۔ ”پتہ نہیں  
شام کو کہاں مر گیا ہے!“.....





## صُبح کا بھولا

اس دن وہ بہت سویرے نکل پڑا تھا۔ آسمان کے مٹیالے دھندلکے میں اکا دکا تاروں کے جگنو چمک رہے تھے۔ یورب کے ایک کونے میں بھور کی پہلی سپیدی نمودار ہونے لگی تھی۔ کاندھے پر مل اور ہاتھوں میں بیلوں کی رسی تھامے جب بھورا گلی میں آیا تو ہر طرف سناٹا چھایا ہوا تھا۔ فرش کی اینٹوں پر قدموں کی آواز دور تک چوہاڑوں سے ٹکرائی کر لوٹ رہی تھی۔ ہوا کے سبک جھونکوں میں نمی کے ساتھ جنگل کی وحشی خوشبو گھلی ہوئی تھی۔ اتنے سویرے چار پائی چھوڑتے ہوئے بھورے کو بڑا برا لگا تھا۔ بڑا اُلکس آیا تھا..... جون کے پتے دنوں اور دہکتی راتوں کے بعد صبح صبح کے شبنمی منیدہ یہہ چند لمحات ہی تو ہوتے ہیں، جب آدمی جین کی نیند سولیتا ہے۔ مگر بھورے کو اس دن بہت سا کام کرنا تھا۔

گلی سے نکل کر جب وہ پتھروں کے فرش پر پہنچا تو ایک آدھ آدمی اور بھی نظر پڑا۔ کسی کسی گھر سے چکی کی آواز بھی آنے لگی تھی۔ مل گچھے اجالے میں اس کے بالائی سے سفید بیلوں کی جوڑی بڑی شاندار لگ رہی تھی۔ بھورا انہیں پیار سے ”بگلے“ پکارتا تھا۔

پیلل والے کنویں پر پہنچ کر وہ رک گیا۔ بگلے بھی رک گئے۔ وہ روزیہاں پانی پیتے تھے۔ جھوترے کے نیچے مویشیوں کے لئے ایک جو بچہ ہمیشہ پانی سے بھرا ہوتا تھا۔ مل نیچے رکھ کر بھورے نے بیلوں کو حوض پر چھوڑ دیا، اور خود اس کے ٹھنڈے پانی میں پاؤں لٹکا کر بیٹھ گیا۔ بغل کی پستی گلی سے کسی کے آنے کی آہٹ ہوئی۔

”جے رام جی کی چودھری..... کہاں نکل پڑے اتنے سویرے؟“ آنے والا

کنویں کی مٹی پر بیٹھ گیا، اور ڈول پر سے رسی کھولنے لگا۔

”کہیں نا۔ جبر اکھیتوں پر جاؤں ہوں۔“ بھورانے جواب دیا ”کیا نہانے آئے ہو کھنڈیا؟“

کھنڈیا کو دیکھ کر بھورے کو کوئی خوشی نہیں ہوئی۔ اس کا باپ آزادی کے دقت کچھی پنجاب سے آکر اس کے گاؤں میں بس گیا تھا۔ ان بن بلائے مہانوں کو گاؤں میں کوئی پسند نہیں کرتا تھا۔ کھنڈیا نے قمیص اتاری، دھوتی سا کسٹا بھرا، اور ڈول کھینچ کر نہانے بیٹھ گیا۔

”بڑا مزا آ رہا ہے چودھری..... اس کنویں کا پانی بڑا ٹھنڈا ہے۔“ ڈول سر پر خالی کرتے ہوئے کھنڈیا بولا۔

”میری مانو۔ تم بھی ایک ڈول سے پٹا بھگوتے جاؤ۔“ اور ہی کر کے دانت نکالے ہنسنے لگا۔

بھورے کو اسکی ہنسی پر اور غصہ آیا۔ بھی چاہ رہا تھا کہ اس سے بولے۔

”اور رئیس کی اولاد، جبرامیٹھ سے پرے ہٹ کر نہا۔ بھوٹا پانی گر کر کنویں کو گندنا کیوں کئے دے رہا ہے؟“ مگر وہ بولا کچھ نہیں۔

ان ریفوجیوں نے تو سارے گاؤں کا پانی گندا کر دیا ہے۔ اس نے سوچا۔

بیل پانی پی چکے تھے۔ ہل کندھے پر رکھ کر اس نے ہاتھ کی رسی کو ہلکا سا جھٹکا دیا۔

”لے اب چلو، میرے بگلو۔“

”تمہارے بگلوں کو تو نظر لگ رہی ہے چودھری! کھنڈیا نے پھر ایک بار گفتگو کا سلسلہ جوڑنا چاہا۔ مگر بھورا بے رنجی سے پلٹ آیا۔

اس کا بھی کبھی ان لوگوں سے بات کرنے کو نہیں چاہا تھا۔ ”بگلوں“ کی تعریف سن کر بھی نہیں۔ بیسیوں بار اپنے پاپو سے وہ ان لوگوں کی برائیاں سن چکا تھا۔ ”سُسرے، کام چور، نکمے۔ اور جانے کیا کیا! عورتیں اپنے بچوں کو ان کے سائے سے بچاتی تھیں، کیونکہ ان کی عورتیں لڑا کا، اور بچے فیل مچانے دلے تھے۔ جہاں وہ بے تھے، غلاطت اور سُراند بڑھادی تھی۔ چند ایک نے جھوٹے کلیموں پر زمینیں الاٹ کر لی تھیں۔ مگر دن رات محنت کر کے اتنی پیداوار کر لی جو دوسرے کبھی نہ کر سکے۔ بیوپار میں گھسے تو ایسے کہ جوڑ توڑ سے گاؤں

سارا بیوی بچے میں کر لیا۔ اب کون مقامی آدمی انہیں پسند کرتا؟

”کیوں نہ انہیں نکال یا ہر کریں!۔۔۔ ہم نے بلایا تھوڑی تھا ان بے گھروں کو بڑھ“

— ایک رات بوڑھا نمبردار چوپال میں سیخ پڑا تھا۔

بجھورا اپنے بیلوں کو لئے آبادی سے باہر آگیا۔ خیراتی ہسپتال کے سامنے جہاں لاریوں کا اڈا تھا۔ لوگ ابھی تنگ سڑک کے کنارے چار پائیاں ڈالے سوئے پڑے تھے۔ لاریاں بھی سوئی پڑی تھیں۔ صرف ایک میں ڈرائیور بیٹھا بیٹری پی رہا تھا۔ شامِ صبح اس کی لاری پہلے نمبر پر تھی۔

آگے گندے نالے کا پل تھا۔ پل کے پرے جڑ ہڑ کے کنارے جامنوں کے بیڑوں تلے گاؤں کی بھیریں اور بکریاں جمع ہوئی شدرع ہو گئی تھیں۔ جو ہڑ میں سنگھاڑوں کی میل ہینہ کی طرح پھیل رہی تھی۔۔۔۔۔۔ وہ جب چھوٹا تھا تو بھیکو کے ساتھ دوپہر کے سنسٹے میں نکلاڑے جڑا چرا کر کھایا کرتا تھا۔ اور جب رکھوالا ان کو تاڑ دیتا تو دونوں تیسر کر دوسرے کنارے جا بیٹھے اور سیلو اور کرلی کی بھارڑیوں میں پھپھپ جاتے۔ یا اینٹوں کے بھٹے پر چڑھ کر بوڑھے رکھوالے کا منہ بیڑا تے۔۔۔۔۔۔

”جے رام بھی کی سکا کا ..... بڑے سڑکے چل دئے آج تو!“ کوئی بھوکے کے پاس سے گذرتے ہوئے بولا۔ اور بھورا بچپن کے میٹھے سپینوں سے چونک پڑا۔ یہ دھلیا چرواہا تھا، جو اپنا دیڑر سنبھالنے جہانمیں تلے چار رہا تھا۔

”آج میری دالے دونوں بیگھے جوتنے ہیں۔“ بھورے نے جواب دیا ”پڑے پڑے سوکھ رہے ہیں۔“

”لوٹے کو بھیج دیا ہوتا — آخر وہ کب کام آئے گا؟“

”ایسا ناہے دھلیا۔ وہ بہو کو لانے سسرال گیا ہے۔ میں نے سوچا، میں ہی

پہلا جیلوں۔“

مگر دُھلیا اپنا لُٹہ سنبھالتا، یا بس پگ ڈڈی پر مڑ گیا تھا۔۔۔۔۔ کسی زمانے میں دُھلیا کے ساتھ اس کی چھوٹی بہن مشرقی بھی ہوا کرتی تھی - ننھی منی سی شریقی ، جو

رنگ برنگے گھاگھروں میں گڑیا سی ناچتی پھرتی ۔ اور بھورا محض اس کی خاطر روز صبح سویرے  
جامنوں کے پیٹروں تلے آ بیٹھتا تھا ۔ اور پھر ..... دھیرے دھیرے شرتی بھی جان گئی  
قتی وہ روز کیوں وہاں آ بیٹھتا ہے ۔ اور پھر ان کی معصوم محبت کا سہا سہا رومان شروع ہوا تھا  
صبح دم کھیتوں میں پچھلتے ہوئے پانی کی طرح پاکیزہ !

لیکن وہ دن کسی بھولے بھٹکے بادل کے سائے کی طرح بہت جلد گزر گئے ۔ شرتی کا  
ماہ کسی اور گناہ میں ہو گیا ۔ اور بھورے کے دل کی بستی جامنوں کی چھاؤں کی طرح سونی وہ گئی ۔

بھورا ایک بھر بھری لے کر آگے بڑھ گیا ۔

پتلی سی پگ ڈنڈی کھیتوں کی مینڈھ پر سرکنڈوں کے بھنڈوں میں سے بھتی بجاتی  
ریل کی پٹری کی طرف جا رہی تھی جہاں بھورے کے کھیت تھے ۔ تقوڑی تقوڑی دور اس پگ ڈنڈی  
سے کوئی چھوٹی سی شاخ بھوٹ کر کھیتوں میں غائب ہو جاتی یا پاس کی بھاڑی سے کوئی خرگوش  
اچھل کر گیند کی طرح لڑھکتا پھلتا نظروں سے اوجھل ہو جاتا ۔ بھورا اور اس کے بیل ممانت  
کے ساتھ پگ ڈنڈی کے بلوں پر آگے بڑھے جا رہے تھے ۔ کھیتوں میں جگہ جگہ کھاد کی  
ڈھیریاں بنی ہوئی تھیں جن کے درمیان تیتروں اور بیسروں کی ٹولیاں بھی نظر آ جاتیں ۔ درختوں  
پر چڑیوں کا شور اب کم ہو چلا تھا ۔ مگر اوپر آسمان کی دھنوں میں ٹیڑھوں کی سیٹیاں ابھی تک  
تیر رہی تھیں ۔

کھیتوں پر پہنچتے پہنچتے اچھا خاصا دن نکل آیا تھا ۔ ریل کی پٹریاں دور تک سلگے ہوئے  
نیشنل کی طرح جھک رہی تھیں ۔ کچھ دور جہاں نہر کا پل تھا ، مزدور ہاتھوں میں بیلچے لئے  
لائن پر کام کر رہے تھے ۔ بھورے کے کھیت لائن کے دوسری طرف تھے ۔ بیری کی چھاؤں میں  
ستا کر اس نے بیل بوڑ دئے ..... سدھے ہوئے جاور سی کے ہلکے سے اشارے پر بندھی  
ہوئی رفتار سے کھیت کے دوسرے سرے تک جا پہنچتے اور پھر لوٹ آتے ۔ پیچھے ہل پھوٹتی  
سے پیر جھائے بھورا کھڑا رہتا ۔ اور زبان سے عجیب عجیب آوازیں نکال کر بیلوں کی رہبری کرتا جاتا ۔  
کھیت کے سپاٹ سینے پر ایک کے بعد ایک چھوٹی چھوٹی ، بھوری بھوری نہریں بنتی چلی جاتیں ۔۔۔  
بھورے کے آگے کھاد کے کھیت تھے ۔ مگر وہ آج نہیں آیا تھا ۔ اس کے آگے

تجوانائی کے کھیت تھے۔ اور وہاں اس کا بیٹا ہل چلا رہا تھا۔ برلی طرف، بخر ٹیلوں کے آگے ایک ٹریکٹر چل رہا تھا۔ آموں کے جھنڈے ٹوب دیل کی کراہیں دور تک پھیلی ہوئی تھیں۔ اور جب اس ماحول کی یکسانیت کو سمجھوڑتی ہوئی کوئی ریل گاڑی کھیتوں کے یسج سے دندناقی ہوئی گذر جاتی تو ایک ذری دیر کے لئے سب لوگ اپنی اپنی جگہوں پر کام روک کر کھڑے ہو جاتے۔ اور ان کی نظریں پٹریوں پر دور تک ریل کے تعاقب میں پھسلتی جاتیں۔ گاڑوں کے کٹنے کر ٹیل جوان ان ہی ریلوں میں بیٹھ کر جانے کہاں کہاں بکھر گئے تھے۔ یہہ ریلیں لوگوں کو بے جانا جانتی ہیں، واپس نہیں لاتیں!

اور اب سائے سمنے لگے تھے۔ سورج کی نرم کرنوں میں رچی ہوئی سگلابی ہوائیں کبھی کی ختم ہو چکی تھیں۔ ان کی جگہ گرم ہوا کے جھکڑوں نے لی تھی۔ زمین تپنے لگی تھی اور سال چپ چاپ سر نیر دھائے ہل چلا رہے تھے۔ کھیتوں پر سناٹا ہانپ رہا تھا۔ جنگل کے پنکھ پکھیر بھی پٹریوں میں جا چھپے تھے۔ اس چل چلاتے سناٹے میں مزدوروں کے بیلچوں کی آوازیں اور بھی جیجھتی ہوئی لگ رہی تھیں جو لائن کے ردڑوں سے ٹکرانے سے پیدا ہو رہی تھیں۔

اور جب سورج سر پر آگیا اور بھوس کے روئیں روئیں سے پسینہ پھوٹ نکلا تو اس کی گھروالی روٹی لے آئی۔ بھورے نے آدھے سے زیادہ کام ختم کر لیا تھا اور اب تھکن محسوس ہو رہی تھی۔ بیلوں کو کھول کر دیل کی پٹری کے پاس ایک گھنے شیشم کے نیچے باندھ دیا۔ اسی کا گھنی چھاؤں میں خود بھی روٹی کھانے بیٹھ گیا۔ لائن والے مزدور بھی اب رک گئے تھے اور پٹری کے دوسری طرف کسی درخت کے نیچے سنا رہے تھے۔

بھورا روٹی کھا چکا تو گھروالی واپس چلی گئی۔ لیکن وہ اسی طرح شیشم کی ٹھنڈی چھاؤں میں پڑا رہا۔ ابھی اور تھوڑی دیر سٹالوں اس نے سوچا۔ مگر اسی لمحے وہ چونک پڑا۔ اس کے سامنے لائن پر کام کرنے والوں میں سے ایک بوڑھا مزدور اکھڑا ہوا تھا۔ جس کی مرتھائی ہوئی آنکھیں چہرے کی جھریوں میں دھنس گئی تھیں۔

”بھیا۔ ایک بات مانو گے میری؟“ بچوں کی سسی سادگی سے اس نے پوچھا۔ اک ذرا کی ذرا یہہ ہل بیل بے کرتھارے کیفیت کو میں بوت دوں؟“ آواز کی لرزش سے جذبات کی شدت

کا پتہ چلتا تھا۔

بھورے کی کچھ سمجھ میں نہیں آیا۔ حیران نظروں سے اسے گھورے جا رہا تھا۔

”گھبراؤ نہیں بھیا۔ مجھے ہل چلنا خوب آتا ہے“ آگے بڑھ کر وہ بیلوں کو بڑے پیار سے تھپ تھپانے لگا۔ ”کیسے پہاڑ سے جانور ہیں!“ ————— اس کی پتھر سی سخت اور بے جان آنکھوں میں ایک نئی چمک اُٹھ تھی۔ جیسے بچے کو کھلونوں کی دکان مل جائے !

”جوت لو بھائی۔ اپنے ہی جانور سمجھو“ بھورے سے انکار نہ ہو سکا۔ ”بڑے پردے ہیں یہ بیل“..... ایک اشارے پر بیل نکلیں گے۔“ اور دل ہی دل میں سوچا ہرج ہی کیا ہے ! وہ تو آپ ہی صبح سے ہل چلاتے تھک چکا تھا۔

اور شیشم تلے سے بیلوں کو کھولتے ہوئے بوڑھے مزدور کا چہرہ خوشی سے متمتا رہا تھا۔ ”جانتے ہو بھیا“..... تمہیں بھورے ہل چلاتے دیکھ رہا تھا۔ ہاتھ میں بیلچہ تھا، مگر آنکھیں تم پر ہی تھیں !“

اور حیب ہل بیل لئے وہ کھیت پر چلایا گیا تو بھورا سوچنے لگا..... یہ کیسا آدمی ہے ! بھلا اس پتلی ہوئی دوپہر ہی میں کس کا سچی چاہے گا ہل چلانے کو ؟ اور پھر.... ہل جمتنے میں کیا رکھا ہے ؟..... کوئی پاگل تو نہیں ہے ؟۔

اور اب بیلوں کو جوڑ کر وہ بڑے انہماک سے ہل چلا رہا تھا۔ اس کے بوڑھے اور غیر مانوس ہاتھوں میں بیلوں کو کوئی اجنبیت محسوس نہیں ہو رہی تھی۔ شاید دھیرے دھیرے وہ کچھ گنگنا تا بھی جا رہا تھا۔ اور شیشم کی بھاؤں میں بیٹھا بھورا غویت کے عالم میں اسے دیکھے جا رہا تھا۔ اسے پتہ بھی نہ چلا کہ لائن والے دوسرے مزدور بھی اس کے پاس آکھڑے ہوئے ہیں۔ اور وہ بھی اسی حیرت اور دل چسپی سے اسے ٹک رہے ہیں۔ بھورا چونک پڑا۔

”کیوں بھیا..... یہ مانس کون گاؤں کا رہنے والا ہے ؟“ بھورے نے ہلکے سے مسکراتے ہوئے ان سے پوچھا۔ لیکن ان کے چہروں پر مسکراہٹ کی ایک کرن تک نمودار نہ ہوئی۔ وہ سب چپ چاپ کھڑے اپنے ساتھی کے جوش و خروش کو دیکھ رہے تھے۔

..... بھورے کی سکر ہٹ بھی سہم کر سٹنے لگی۔

ان میں سے ایک، جو عمر میں دوسروں سے بڑا دکھائی دیتا تھا، بھورے کے قریب

ٹھک آیا، اور آہستہ آہستہ کہنے لگا —

"ہم لوگ ریغوبجی ہیں بھیا..... برہمنے والے اسی دیس کے ہیں۔ بے گھر

ہو گئے ہیں..... ادھر یورپ میں تھا ہمارا گاؤں۔ ایسا دنکا ہوا کہ سب کچھ بھوڑ کر

بھاگ آنا پڑا — گاؤں کے گاؤں جلا دیئے۔ ہماری زمینیں بھی جھن گئیں —

آتما کے بغیر حالی شری لے بھٹکتے پھر رہے ہیں۔"

اس کی آنکھوں میں نمی تیر رہی تھی۔ نظریں اٹھا کر وہ ہل چلانے والے بوڑھے کو

دیکھنے لگا — "کھیتوں کے بغیر یہ بڑھا بھی نہ سکے گا۔ ہل، بیل، کھیت، ادھلیا

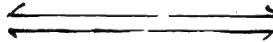
اس کی رگ رگ میں بسے ہوئے ہیں۔ لائن پر درڑی پھینکتے پھینکتے وہ کھیتوں میں لہلہاتی

فصلوں کو دیکھ کر رونے لگتا ہے — کہتا ہے، کوئی میرا سب کچھ لے لے، میری جان لے،

پر فحجے ایک بیگمہ زمین اور ایک بیل دے دے!"

وہ چپ ہو گیا۔ بھورا بھی خاموشی سے اٹھ کر اس کے پاس آ گیا.....

سب چپ چاپ ایک ہی طرف دیکھ رہے تھے۔





## پیر گام کا ڈاک بنگلہ

اپنی تمام سنہری لچیلی کرنیں لئے سورج مغرب میں ایک بڑی سی چٹان کے کچھ پہا گیا تو اُس نے کھڑکی کی چوکھٹ پر رکھے ہوئے اپنے ہاتھ پر سے سراٹھالیا۔ وہ بہت دیر سے اسی طرح بیٹھی تھی اور اب اس کا ہاتھ درد کرنے لگا تھا۔ ہاتھ ہٹا کر اب اُس نے چوکھٹ پر اپنا گال ٹیک دیا اور دُور افق میں گم ہوتے ہوئے ایک پہاڑی سلسلے کو دیکھنے لگی۔

نیچے میدانوں میں اندھیرا آہستہ آہستہ پھیلتا جا رہا تھا۔ کٹے ہوئے پلوتن اور پھوس کی گھڑیاں باندھ کر کان گھر لوٹ رہے تھے۔ بڑی بڑی گھڑیوں میں گردن تک سردھنٹے کھیتوں میں گزرتے ہوئے وہ یوں لگ رہے تھے جیسے عہد قبل مسیح کے بہت سے گرگٹ رینگ رہے ہوں۔ پیپل اور آم کے پیڑوں سے گھری ہوئی ایک ترانی میں تھوڑی تھوڑی دیوبعد مرغابیوں کا ایک غول بلند ہو جاتا اور کہلاتے ہوئے آسمان کی گود میں نقطے سے بنکر گم ہو جاتا اور پھر ایک غول اُسکی جگہ لے لیتا.... اور ہر لمحہ بڑھتے ہوئے اندھیرے میں وہ سڑک بھی تحلیل ہونے لگی تھی جس کو ڈاک بنگلے تک پہنچنے سے پہلے کئی پہاڑیوں پر آٹھ دس مرتبہ چکر کاٹ کر آنا پڑتا تھا۔ کئی خطرناک موڑوں اور گہری کھائیوں سے اسے گزرنا پڑتا اور جب ایک آخری موڑ کے بعد وہ ڈاک بنگلے کے احاطے میں سُرخ سُرخ کنکر پل میں گم ہو جاتی تو مسافر اک ذرا سی دیر کے لئے موٹر روک کر سڑک کے کنارے کھڑے ہو جاتے اور نیچے بل کھاتی ہوئی سڑک کے موڑوں کو دیکھنے لگتے، جیسے کوئی بہت بڑا انڈیا پہاڑیوں کے دامن سے بٹھا پڑا ہو..... اور اس وقت بھی وہ اسی سڑک کی بعض قوسوں کو دیکھنے کی کوشش کر رہی تھی جو چاروں طرف سے اندھیرے میں ڈوب گئی تھیں لیکن جن کا پتہ ان سے اٹھنے والی دُھول کے ہلکے ہلکے بادل دے رہے تھے۔ کیونکہ ان پر سے ابھی ابھی ایک موٹر گزری تھی۔

اور اس موٹر میں اس کی بیٹی شبنو اپنے شوہر کے ساتھ جھرلاب جا رہی تھی۔ ان دونوں کی شادی ابھی دو تین ہی دن پہلے ہوئی تھی اور آج وہ اپنی بیٹی اور داماد کو اپنے شوہر کے پاس بجا رہی تھی، اسے دکھانے کہ اس کی لڑکی دلہن کے روپ میں کیسی لگ رہی ہے! اپنی لڑکی کی زندگی کے ہر اہم لمحہ پر وہ اسے اپنے شوہر کے پاس ضرور لیجاتی اور جھرلاب کی بستی کے باہر ویران قبرستان کے ایک کونے میں کھڑی وہ اپنے شوہر کی قبر سے جانے کیا کیا باتیں کرتی..... اس کے انتقال کے بعد سے جیسے یہ اس کی عادت ہو گئی تھی۔

شوہر سے جھرلاب جاتے ہوئے اس سے پہلے بھی وہ کئی بار اک ذرا سی دیر کے لئے پیرگام کے ڈاک بنگلے میں ٹھہری تھی، خوبصورت سبز پوش پہاڑیوں میں گھرا ہوا یہ ڈاک بنگلہ در سے یوں لگتا جیسے درخت کی شاخوں میں گھرے ہوئے گھونسلے میں ایک انڈا رکھا ہو، اور ان انڈا جیسی جلی دیواروں کے اندر اس نے کتنے ہی لمحات اپنے شوہر کے ساتھ گزارے تھے، جب وہ زندہ تھا اور وہ خود اپنی بیٹی شبنو جیسی خوبصورت تھی، یا شاید اس سے بھی زیادہ خوبصورت تھی! اس کا شوہر اس علاقے میں سب سے بڑا زمیندار تھا، اور پیرگام کے ڈاک بنگلے پر اسے اپنے گھر ہی کا سا اختیار حاصل تھا..... لیکن یہ سب گزری ہوئی باتیں تھیں، اب نہ اس کا شوہر زندہ تھا اور نہ وہ اس کا سن! اب تو اس کے چہرے کی پسلی رنگت اور اس پر بے شمار جھریوں کو دیکھ کر کسی بہت پکے ہوئے پلے آم کا خیال آجاتا تھا۔ اور ان جھریوں کے جال میں اس کا پوپلا منہ یوں لگتا جیسے اس آم میں کسی نے دانت گڑو دے دیے ہوں۔ اس کا سارا حسن، ساری جوانی نہ جانے کب اور کیسے چپکے ہی چپکے شبنو نے چرائی تھی۔ اور جب وہ دلہن بنی موٹر میں اسے برابر بیٹھی تھی تو وہ اسے دیکھ کر چونک پڑی تھی۔ وہ بھی کسی زمانے میں اپنے شوہر کے ساتھ اسی طرح موٹر میں جایا کرتی تھی..... لیکن پھر اس کی آنکھوں میں آنسو ڈبڈبائے.... خوشی کے آنسو!

شوہر کے انتقال کے بعد پیرگام کے ڈاک بنگلے میں جب کبھی وہ ذرا سی دیر کو ٹھہرتی تو اسے بے شمار پرانی باتیں یاد آنے لگتیں۔ بیسیوں یا دین وقت کے کھنڈروں میں سے جی اٹھتیں، اور ان سب سے گھرا کر وہ جلد ہی وہاں سے چل دیتی۔ لیکن آج شام جب وہ ڈاک بنگلے کے سامنے لان پر بیٹھی جائے پی رہی تھی تو شبنو اور واجد چائے پی کر ٹہلتے ہوئے قریب

ہی ایک ٹیلے پر بنی ہوئی لکڑی کی ایک بُرجی پر چلے گئے۔ یہ بُرجی بہت خوبصورتی سے ساگون کی لکڑی سے بنائی گئی تھی۔ چھوٹے چھوٹے گول ستون اور ان پر کسی بادبانی جہاز کے عریشے کی شکل کی خوبصورت چھت چینی وضع پر بنی ہوئی تھی۔ اور اس بُرجی کے فوراً بعد ہی وہ پہاڑی ختم ہو جاتی تھی، وہاں سے میلوں دور نیچے کا منظر جیسے نظر میں بس کر رہ جاتا تھا۔ شبو اور داجد بھی اس منظر کے نشیب و فراز میں کھو گئے تھے۔ بُرجی کے ستونوں کے درمیان وہ خاموش کھڑے کبھی ایک دوسرے کو دیکھنے لگتے، کبھی دوسرے پھیلے ہوئے دھلاؤں اور کھیتوں کو تنکے لگتے، اور کبھی بُرجی کی چھت اور ستونوں کو گھورنے لگتے۔۔۔۔۔ شام کے تھکے ماندے سورج کی کرنیں ان کو اور اس بُرجی کو اپنا سارا نور دیکر مغربی پہاڑیوں میں سوجانا چاہتی تھیں۔۔۔۔۔ اور پھر شاہدہ نے دیکھا کہ داجد نے اپنی جیب سے تلم نکالا اور وہیں کھڑے کھڑے بُرجی کے ایک ستون پر کچھ لکھنے لگا۔ وہ لکھ چکا تو شبو نے تلم اپنے ہاتھ میں لیا اور اسی جگہ وہ بھی کچھ لکھنے لگی۔۔۔۔۔ اور پھر وہ وہاں سے چلے آئے۔ لیکن اس چھوٹے سے واقعے نے شاہدہ کے دماغ میں ہلچل سی مچادی، وہ بے اختیار سی ہو کر اٹھی اور اس بُرجی میں چلی آئی، اسکی نظریں اسی ستون پر کچھ تلاش کرنے لگیں، اور بالآخر وہ ایک جگہ جا کر رُک گئیں۔

”ہم کبھی جدا نہ ہوں گے۔ ۲۰ اکتوبر ۵۵ء“

اور اس کے نیچے شبو اور داجد کے دستخط تھے۔

اور شاہدہ اس بُرجی کی چھت اور ستونوں پر لکھے ہوئے اسی طرح کے بے شمار فقروں میں ایک اور فقرہ تلاش کرنے لگی۔ اسے یہ یاد نہیں رہا تھا کہ کہاں تلاش کرنا چاہیے۔۔۔۔۔ وہ بھی یہیں کہیں لکھا گیا تھا۔۔۔۔۔ آج سے پورے بیس سال پہلے۔۔۔۔۔ یہی وقت تھا، یہی موسم! یہی ہوائیں تھیں اور ایسی ہی سرگوشیاں لیکن وہ فقرہ اسے نہ مل سکا۔ وہ تھک گئی تھی۔ دماغی مہیاں نے اسے بہت زیادہ تھکا دیا تھا، یکے بعد دیگرے بیسوں یادیں اس کے ذہن میں جاگتی چلی گئیں اور وہ ان میں پھنس کر بے بس ہو کر رہ گئی تھی، اس نے فیصلہ کر لیا وہ رات وہیں ڈاک بنگلے میں گزارے گی۔ اسے اپنی تمام یادوں، گزری باتوں کی محفل سبانی تھی۔۔۔۔۔ تنہا۔ شبو اور داجد کی موجودگی بھی اس محفل میں گوارا نہ تھی۔ یہی سوچ کر

اُس نے ان دونوں کو موٹر میں جھرلاب بھیج دیا تھا اور شو فر کو صبح واپس آنے کے لئے کہہ دیا تھا۔  
 شبو اور واجد ان باتوں سے لاعلم، چپ چاپ جھرلاب چلے گئے، اور پیر گام کے ڈاک بنگلے کا بڑھا  
 چوکیدار جب شام کو چراغ روشن کرتا اس کے کمرے میں آیا تو اسے بھی اپنی بوڑھی مالکن کے  
 پہرے پر کچھ عجیب سے رنگ جھلکتے نظر آئے۔ چوکیدار چلا گیا تو شبو نے پھر ایک بار اس کھڑکی میں  
 سے پہاڑیوں کی ڈھلانون پر نگہ کرے ہوئے اندھیرے اور ان اندھیروں میں گم ہوتی ہوئی  
 سڑک کی قوسوں کو دیکھنے کی کوشش کی جن کا پتہ دھول کے ہلکے ہلکے بادل دے رہے تھے، یہ  
 بادل ابھی ابھی اس سڑک پر سے ایک موٹر کے گزرنے سے پیدا ہوئے تھے، اور اس موٹر میں شبو  
 اور واجد جھرلاب جا رہے تھے۔

اور اب اسکی یادوں کی محفل آراستہ ہوتی جا رہی تھی — اسی سڑک سے ایسی  
 ہی موٹر میں ایک دن وہ اپنے شوہر حمید کے ساتھ پاس کے ایک گاؤں جا رہی تھی، وہاں کوئی  
 میلہ لگا ہوا تھا۔ حمید اسے بے حد اصرار کر کے ساتھ لئے جا رہا تھا۔ وہ اُسے بے انتہا چاہتا تھا  
 اور شاہدہ خود بھی اسکی دیوانی تھی، ان دونوں کی محبت گاؤں بھر میں مثال بن گئی تھی.....  
 جب میلے والا گاؤں تھوڑی دور رہ گیا تو حمید نے ایک جگہ موٹر چھوڑ دی، وہ اپنے ساتھ کچھ  
 عجیب سے کپڑے لایا تھا۔ بالکل ایسے ہی جیسے وہاں کے گاؤں کے لوگ عام طور پر پہنا  
 کرتے تھے، وہ چاہتا تھا انہیں میلے میں کوئی پہچان نہ سکے اور وہ بھی گاؤں کے عام لوگوں کی طرح  
 خوب جھا بھر کر گھومیں پھر یں اور لطف اٹھائیں۔

اور جب وہ اس لباس میں میلے میں گھومنے لگے تو واقعی کوئی اُن کو پہچان نہ سکا۔ حمید  
 اس لباس میں گاؤں کا ایک بچہ جیوان لگ رہا تھا۔ جوڑا سینہ، بکھرے بال، مضبوط اور لمبے لمبے  
 ہاتھ پیر، اور اس کے برابر ہی پیلی اور گلابی اڈھنی اور سرخ ڈھیلے ڈھالے ہنٹکے میں، کہنیوں تک  
 جوڑیاں پہنے، شاہدہ گاؤں کی ایک شرمیلی، نئی نویلی دلہن معلوم ہو رہی تھی، وہ دونوں اس دن  
 بہت خوش تھے! دن بھر ادھر ادھر گھومتے رہے، لیلی مجنوں اور ہیرا رانجے کا تماشا دیکھا  
 گنا، بیر اور مونگ پھلیاں کھائیں، مداری کے کرتب اور سینڈ کے کھیل دیکھے، اور آخر میں میلے  
 کے فوٹو گرافر کی دوکان پر جا کر دونوں نے ایک تصویر کھنوائی۔ پیچھے ایک بڑا پردہ تھا جس پر پہاڑوں

کنویں کی منڈیر پر بیٹھ گیا، اور ڈول پر سے رسی کھولنے لگا۔  
 ”کہیں نا۔ جبراکھیتوں پر جاؤں ہوں۔“ بھورانے جواب دیا ”کیا نہانے آئے  
 ہو کھنیا؟“

کھنیا کو دیکھ کر بھورے کو کئی خوشی نہیں ہوئی۔ اس کا باپ آزادی کے وقت چھپی  
 پنجاب سے آکر اس کے گاؤں میں بس گیا تھا۔ ان دن بلائے مہمانوں کو گاؤں میں کوئی پسند  
 نہیں کرتا تھا۔ کھنیا نے قمیص اتاری، دھوتی سا کسٹا بھرا، اور ڈول کھینچ کر نہانے بیٹھ گیا۔  
 ”بڑا مزا آ رہا ہے جو دھری..... اس کنویں کا پانی بڑا ٹھنڈا ہے۔“ ڈول  
 سر پر خالی کرتے ہوئے کھنیا بولا۔ ”میری ماں۔ تم بھی ایک ڈول سے پٹا بھگوتے جاؤ“  
 اور ہی کر کے دانت نکالے ہنسنے لگا۔

بھورے کو اسکی ہنسی برا اور غصہ آیا۔ بھی چاہ رہا تھا کہ اس سے بولے  
 ”اور رئیس کی اولاد، جبرامینڈھ سے پرے ہٹ کر نہا۔ بھوٹا پانی گر کر کنویں کو گندرا  
 کیوں کئے دے رہا ہے؟“ مگر وہ بولا کچھ نہیں۔

ان ریفیو جیوں نے تو سارے گاؤں کا پانی گندرا کر دیا ہے۔ اس نے سوچا۔  
 سیل پانی پی چکے تھے۔ ہل کندھے پر رکھ کر اس نے ہاتھ کی رسی کو ہلکا سا جھٹکا دیا  
 ”لے اب چلو، میرے بگلو۔“

”تمہارے بگلوں کو تو نظر لگ رہی ہے جو دھری! کھنیا نے پھر ایک بار گفتگو  
 کا سلسلہ جوڑنا چاہا۔ مگر بھورا بے رخی سے پلٹ آیا۔

اس کا بھی کبھی ان لوگوں سے بات کرنے کو نہیں چاہا تھا۔ ”بگلوں“ کی تعریف سن کر  
 بھی نہیں۔ بیسیوں بار اپنے باپو سے وہ ان لوگوں کی برائیاں سن چکا تھا۔ ”سُمرے،  
 کام چور، نیکے۔ اور جانے کیا کیا! عورتیں اپنے بچوں کو ان کے سائے سے بچاتی تھیں،  
 کیونکہ ان کی عورتیں لڑا سا، اور نیچے فیل مچانے والے تھے۔ جہاں وہ بے تھے، غلاطت اور سُرائد  
 بڑھادی تھی۔ چند ایک نے سمجھوٹے کلیوں پر زمینیں الاٹ کر لی تھیں۔ مگر دن رات محنت کر کے  
 اتنی پیداوار کی جو دوسرے کبھی نہ کر سکے۔ بیوپار میں گھسے تو ایسے کہ جوڑ توڑ سے گاؤں

احاطہ کے باہر تک وہ دوڑتی چلی گئی۔ اس خوفناک تنہا رات میں اسے ذرا بھی ڈرنہ لگا۔ اور پھر ایک بڑے سے پتھر پر پڑھ کر وہ نیچے بیسیوں فٹ گہرے گھڈ میں کودنے لگی ..... لیکن پھر کسی آن جانے جذبے کے تحت وہ ڈک گئی، چند لمحے خاموش کھڑی رہی، اور پھر زور زور سے روتے ہوئے وہ اوندھے منہ اس پتھر پر لیٹ گئی۔ اس کے آنسو پتھر میں جذب ہوتے چلے گئے .... اور جب روتے روتے تھک گئی تو آہستہ سے دوزانو ہو بیٹھی، وہ سامنے تاریکیوں میں گھور رہی تھی .... گھورتی چلی گئی، جیسے وہاں اسے کوئی عظیم طاقت کوئی غیر انسانی قوت نظر آرہی ہو .... اس کی بے پناہ محبت امید کا روپ دھارے اس کے سامنے کھڑی ہو، اور وہ اس سے اپنے دل کی تمام باتیں کہتی چلی گئی .... باتیں جو حمید کے لئے تھیں اس کی زندگی، اس کی محبت کے لئے تھیں، اور ان باتوں نے اس کا ذہن اس کا فہم سمجھ بھی کچھ جذب کر لیا تھا، جلنے کب تک اسی طرح گم سم بیٹھی رہی

اور پھر صبح ہو گئی، ہلکے ہلکے اُجالے میں اسے ڈاک بنگلے کی سفید عمارت نظر آرہی تھی، وہ اٹھی اور آہستہ آہستہ اندر داخل ہو گئی، وہ حمید کے کمرے میں گئی، وہاں پلنگ پر کھل اور وہ خاموش پڑا تھا، شاہدہ نے اس کا ہاتھ چھوا، اور پھر پیشانی، چہرہ اور گردن پر باری باری ہاتھ پھیر پھیر کر یقین کرنا چاہا کہ وہ واقعی زندہ تھا! .... اس کا حمید زندہ تھا وہ اس سے لیٹ گئی۔ دُور جذبات سے اسکی آنکھوں سے آنسو بہہ نکلے ... اسے یقین ہو گیا اب حمید نہیں مر سکتا۔ ... وہ دن بھر اسی طرح تیز بخار میں بیہوش پڑا رہا مگر اس کی حالت سنبھلتی گئی جو کیدار جاکر قریب کے گاؤں سے کچھ دوائیں لے آیا تھا، دوسرے دن صبح حمید کو ہوش آگیا، اور شام کو اس کا بخار اترنے لگا، ..... اور تیسرے دن وہ بالکل ٹھیک ہو گیا ..... شام کی چاء پی کر واپس بھرلاب جانے سے پہلے وہ دونوں ٹہلتے ہوئے اسی لکڑی کی بُرجی کے پاس چلے گئے تھے .... وہاں اس کی پھت اور ستونوں پر انھیں بیسیوں جملے، سیاہی، پنسل اور کولروں سے لکھے ہوئے نظر آئے، شاید ان سے پہلے جتنے مسافر، سیاح وہاں آئے تھے، اس بُرجی پر کچھ لکھ گئے تھے .....

حمید چپ کھڑا ان جملوں کو دیکھ رہا تھا، کبھی کبھی وہ شاہدہ کو دیکھ لیتا، لیکن وہ بالکل

خاموش تھا، اس کے پیر کانپ رہے تھے، سانس پھول سا گیا تھا.... شاید یہ اسکی بیماری کے بعد کی کمزوری کا نتیجہ تھا.... یا شاید وہ دل میں مجھے ہوئے طوفان سے لڑنے کی کوشش کر رہا تھا۔ بالآخر اس نے کوٹ کی جیب سے ایک پنسل نکالی اور ایک ستون کے پاس نکلے ہوئے چھت کے چھچھے پر کچھ لکھنے لگا.... اس کا ہاتھ، انگلیاں اور انگلیوں میں دبی ہوئی پنسل سب کانپ رہے تھے.... وہ لکھ رہا تھا۔

”آج ۲۰ مارچ ۱۹۳۵ء کو شاہدہ نے مجھے نئی زندگی دی ہے — حمید“ اور پھر وہ بھرلاب واپس چلے گئے تھے.... اس کے ایک برس بعد جب شبو پیدا ہوئی تو حمید کا انتقال ہو گیا۔ اسے نمونہ ہو گیا تھا، شاہدہ اب کی بار اسے نہ بچا سکی، لیکن جاتے جاتے وہ شبو کو اس کے پاس چھوڑ گیا تھا.... اور اب شبو ہی اُس کے لئے حمید بن گئی تھی۔

وہ شبو کی ذرا ذرا سی بات حمید کو سنانے اسکی قبر پر جاتی اور ایسے بیان کرتی جیسے وہ سچ منوں مٹی کے نیچے پڑا اسکی ساری باتیں سن رہا ہو۔ اس نے شبو کو بی، اے پاس کرایا۔ اور جب واجد سے اس کی شادی ہو گئی تو شاہدہ کی خوشی کی انتہا نہ رہی، کیونکہ اسے معلوم تھا واجد شبو کو بے حلقہ ہوتا ہے، اور ان کی شادی کے موقع پر واجد اور شبو کو حمید کے حضور میں پیش کرنے کی غرض سے جب وہ شہر سے بھرلاب جا رہی تھی تو پیر کام کے ڈاک بنگلے میں اسی پرانی پوٹی بُرجی میں واجد اور شبو کو، ویسے ہی ایک ستون پر کچھ لکھتے ہوئے دیکھ کر اس کے دل درماخ میں ایک طوفان سا جاگ اُٹھا تھا۔ اس رات بڑی دیر تک وہ انہی یادوں میں گم رہی۔

وہ سوچ رہی تھی کہ واجد اور شبو کو کیا معلوم کہ انہی ستونوں میں سے کسی پر اس کے حمید نے بھی کچھ لکھا تھا، ایسا ہی موسم تھا، یہی ہوائیں اور یہی پہاڑ اور جنگل جب بھی تھے، اسکی آنکھوں میں وہی جملہ گھومنے لگا.... ”آج ۲۰ مارچ ۱۹۳۵ء کو شاہدہ نے مجھے نئی زندگی دی ہے — حمید“ اور پھر اسے شبو اور واجد کے ناموں کے ساتھ ایک اور جملہ ابھرتا دکھائی دیا.... ”ہم کبھی جدا نہ ہوں گے۔“

اور وہ سوچنے لگی شاید ان کے بعد ان کی اولاد میں سے کوئی اور بھی ایسے ہی کسی خوشی کے موقع پر اس ڈاک بنگلے پر سے گزرے اور اس بُرجی میں ایسا ہی کوئی جملہ لکھ جائے ..... کسے معلوم ! اور ابھی جانے ایسے کتنے جملے یہاں لکھے جائیں گے، لیکن ..... لیکن وہ سوچنے لگی ..... کسی میں بھی وہ صداقت، وہ محبت، وہ پاکیزگی نہ ہوگی جو اس کے حمید کے لکھے ہوئے جملہ میں تھی۔

اور ”ہم کبھی جدانہ ہوں گے“ کا عہد کرنے پر بھی جب ان میں سے کسی کو دوسرے سے بچھڑ جانا پڑے گا تو وہ بھی یہاں آکر یہی سوچے گا کہ جو خلاص اور صداقت ”ہم کبھی جدانہ ہوں گے“ میں ہے وہ اور کسی جملے میں نہیں ..... اور یہ چکر یونہی چلتا رہے گا۔ یہ بُرجی یونہی رہے گی، یہ سرگام کا ڈاک بنگلہ یونہی رہے گا۔



## ڈاکٹر احسان

رات کا پچھلا پہر شروع ہو چکا تھا۔ ہوا میں خشکی ناقابل برداشت ہو چکی تھی۔ مگر پرسی کے ڈانس فلور کی رونق میں کوئی کمی نہ ہوئی تھی۔ ایرنوس کا بیڈ اب بھی انگریزی نغمے فضا میں بکھیر رہا تھا اور اس کی لے پر مردوں کے ساتھ ناچتی ہوئی عورتوں کے رنگین لباس اب بھی ہوا میں تتلیاں سی اڑا رہے تھے۔ ہلکے ہلکے تہقہوں کے ساتھ بوتلوں کے کاگ اڑنے کی آوازیں برابر آرہی تھیں۔ فرق تھا تو صرف اتنا کہ پہلا سا جوش اب کم پڑ گیا تھا۔ بیڈ سے نکلنے والے سُر تھکے تھکے سے لگ رہے تھے۔ ڈانس فلور پر ناچتے ہوئے بوڑھے ایک دوسرے کے زیادہ قریب آگئے تھے اور اکثر عورتوں کے لبوں پر لب اسٹک کی شوخی پھسکی پڑ گئی تھی۔ ہوا کے جھونکوں میں ایوننگ ان پیرس اور سیلون مولس کی بجائے رم اور وہسکی گھل چکی تھی۔ میں اور اصغر تازہ ہوا کی تلاش میں ہنگامہ سے ہٹ کر ایک خالی میز کے گرد بیٹھے تھے۔ یہاں سے کھلے آسمان کے پس منظر میں ناریل کے درخت اور ان کے چکنے پتوں پر ہلکی ٹکڑ جاندنی کا عکس بڑا اچھا لگ رہا تھا۔ ڈھلتے چاند کی زرد۔ بے جان ٹلکیہ ہواؤں کے جھونکوں میں ایک کر رہ گئی تھی میں گردن اٹھائے اوپر آسمان کی طرف دیکھ رہا تھا۔

”وہاں کیا دیکھ رہے ہو؟“ اصغر نے گلاس کے پینڈے میں پڑے ہوئے بھسکی کے آخری قطرے حلق میں اڑھیلیتے ہوئے کہا۔ ”اس پھمیکے بے جان چاند میں کیا رکھا ہے! اوھر دیکھو..... ان زندہ چاندوں کو۔ ان کی دودھ میں دہلی چاندنی کی کرنیں کتنی نرم اور نازک ہیں..... کتنی حیات بخش!“ اور اس نے اپنی نظریں اس ایٹکلو انڈین

لڑکی کے برہنہ شانوں پر گاڑیں جو پچھلے ڈانس میں اس کی پارٹنر تھی۔ اور اب کسی اور کے ساتھ ناچ رہی تھی۔

”کم بخت جتنی خوبصورت ہے اتنا ہی اچھا ناچتی بھی ہے۔“ میں نے اصغر کی نظروں کا تعاقب کرتے ہوئے کہا۔ مجھے معلوم تھا وہ اس لڑکی پر بری طرح مٹا ہوا ہے۔ اصغر نے چپ چاپ جیب سے سگریٹ کیس نکالا اور ایک سگریٹ سگال لیا۔

”جانتے ہو کس کے ساتھ ناچ رہی ہے؟“ اس نے آہستہ سے پوچھا۔ مگر میں اس کے پارٹنر کو نہیں جانتا تھا۔ وہ کوئی تیس پینتیس برس کی عمر کا صحت مند شخص تھا۔ اس کے خوبصورت چہرے پر ہلکے سیاہ شیشوں والی عینک بڑی کھپ رہی تھی۔ ”وہ ڈاکٹر احسان ہے۔“ اصغر نے خود ہی بتایا ”شہر کا مشہور ڈاکٹر۔ لوگ کہتے ہیں اس کے ہاتھ میں شفا ہے..... جادو ہے! خاک ہے..... مجھے تو اس کے ہاتھ میں کوئی اور ہی جادو نظر آتا ہے۔ دیکھو تو وہ کم بخت لونڈیا کیسی چپک رہی ہے اس کے ساتھ!“

ڈاکٹر احسان کے بارے میں میں بہت کچھ سن چکا تھا۔ اس کے متعلق لوگ مختلف رائے رکھتے تھے..... بڑا ماہر اور ہوشیار ڈاکٹر ہے..... خریبوں کا بے حد ہمدرد ہے..... بڑا لالچی ہے، ٹوٹ پر بنچا ہے، موڈی ہے..... ڈانس ریس اور جوئے میں دقت گناتا پھرتا ہے.....! مجھے اس سے ملنے کی عرصہ سے خواہش تھی۔

”کیا تم جانتے ہو اس کو؟“ میں نے پوچھا

”بہت اچھی طرح“ اصغر بولا ”ملنا چاہتے ہو؟“

ہاں۔ ”میں نے جواب دیا۔ ڈانس ختم ہونے پر اصغر اٹھ کر چلا گیا اور تھوڑی دیر بعد ڈاکٹر کو لیے واپس آگیا۔ اس کی ہاتھ میں دھسکی کا ایک اور گلاس تھا۔

”ان سے ملو ڈاکٹر..... شہر کے مشہور انجینئر آصف..... تم سے ملنے کے بہت خواہمند تھے!“ اصغر نے تعارف کرتے ہوئے کہا۔ ڈاکٹر کے ہونٹوں پر ہلکی سی مسکراہٹ پھیل گئی۔ ”میں نے آپ کی بہت تعریف سنی ہے“ میں نے سلسلہ گفتگو آغاز کرنے کے لئے کہہ دیا۔

”صرف تعریف ہی سنی ہے!..... برائی نہیں سنی؟“ ڈاکٹر نے ہنستے  
 ”وہ بھی سنی ہے“ اور میں بھی ہنس پڑا۔ بات کا رخ بدلتے ہوئے۔  
 کیا پیچھے گھا؟  
 ”اب کچھ بھی نہیں“ ڈاکٹر نے کہا ”میں بہت تھوڑی بیٹیا ہوں۔ پیسہ بہت کم ہے۔“  
 کر لیا ہے..... اب اور نہیں!“

۔ دوسرا انس مشرور ہو جکا تھا۔ ڈاکٹر کچھ دیر تک  
 ناچتے ہوئے برزوں کو دیکھتے رہے پھر ہولے ہولے کہنے لگے۔  
 ”لوگ کیا جانیں میں یہاں کیوں آتا ہوں!..... مسلسل بیمار، اپاء مچ اور  
 تڑپتے ہوئے انسانوں کے ساتھ رہتے رہتے ایسا معلوم ہونے لگتا ہے جیسے دنیا سے صحت  
 مندرستی، خوشیاں اور تہقے بالکل ختم ہو گئے ہیں۔ اس ہونناک ماحول کے تصور ہی  
 سے جی کانپ جاتا ہے..... ایسے میں یہاں آکر پھر ایک بار دنیا کو نبھوت نظر آنے لگتی  
 ہے۔ جینے کی امنگ جیسے جاگ اٹھتی ہے..... حسن، شباب اور صحت کے نظاروں سے  
 اپنی نگاہوں کے دیرانے پھر سے آباد کر لیتا ہوں.....“ کہتے کہتے وہ اچانک رک گئے۔  
 پھر مسکاکر میری طرف دیکھا۔ اور کھڑے ہو گئے۔ ”معاف کیجئے۔ اب مجھے نیند آرہی ہے  
 ..... پھر کبھی ملاقات ہوگی۔ خدا حافظ۔“ اور وہ باہر کے دروازے کی طرف مڑ گئے۔  
 ان کے جلنے کے بعد اصغر بولا۔

”سب کو اس ہے..... جھوٹ بکاتا ہے۔ یہاں آتا ہے ان لوڈیوں کی خاطر“  
 اور گلاس منہ سے لگا کر غشا غٹ خالی کر دیا۔

ڈاکٹر احسان سے یہ میری پہلی ملاقات تھی۔ اور اس ملاقات میں ان کے بارے  
 میں کوئی اچھی رائے قائم نہ کر سکا۔

کچھ ہی دن بعد مجھے ایک سرکاری کام سے بھٹی جانا پڑا۔ واپس آتے وقت ٹرین  
 میں ڈاکٹر احسان سے پھر ملاقات ہو گئی وہ بھی بھٹی سے آرہے تھے۔ ہم ساتھ ایک ہی

ٹپے میں بیٹھے تھے۔ رسمی سلام علیک کے بعد کچھ دیر ادھر ادھر کی باتیں ہوتی رہیں۔ ان کے متوازن چہرے کے خدخال اس دن کچھ اترے اترے، کچھے کچھے سے نظر آ رہے تھے۔ باتیں کرتے کرتے وہ یکایک خاموش ہو جاتے جیسے کسی سرچ میں غرق ہو گئے ہوں۔ پھر چونک کر گفتگو کا سلسلہ جوڑنے کی کوشش کوئے لگتے۔ رات کا کھانا ہم نے ساتھ ہی کھایا۔ کھانا کھاتے وقت انہوں نے اپنی سیاہیشوں والی عینک اتار کر رکھ دی تھی۔ میں نے ان کی آنکھوں میں دیکھا تو ایک عجیب بے چینی، اداسی سی جھلکی نظر آئی۔ بالآخر میں نے پوچھ ہی لیا۔ ”آپ بہت غمگین، کھوئے کھوئے سے نظر آ رہے ہیں۔ بات کیا ہے، پوچھ سکتا ہوں؟“

”سن کر شاید آپ نہیں گے..... یہ میری ایک کمزوری ہے۔ بے وقوفی ہے“ اور ڈاکٹر کے ہونٹوں پر ایک پھینکی، بے کیف مسکراہٹ پھیل گئی۔ وہ میری طرف دیکھے بغیر بول بول رہے تھے جیسے اپنے آپ سے مخاطب ہوں۔

”یوں، اپنے مریضوں کا علاج پوری توجہ اور محنت سے کرتا ہوں۔ اپنی حرکت کوئی کسر اٹھا نہیں رکھتا..... تمام تدبیروں کے باوجود بعض اچھے نہیں ہوتے۔ میں جانتا ہوں ان کی موت میں میرا کوئی ہاتھ نہیں ہوتا۔ پھر بھی..... پھر بھی مجھے محسوس ہوتا ہے جیسے ان کی موت کا ذمہ دار میں ہوں! میں خطا دار ہوں مجرم ہوں..... شاید مجھ سے کوئی بھول ہو گئی ہو، کوئی کمی رہ گئی ہو!..... اور یہ احساس مجھ پر بڑی طرح چھا جاتا ہے۔ مجھے اپنے آپ سے نفرت سی ہونے لگتی ہے..... بمبئی میں میرے ایک پرلے دوست رہتے ہیں۔ ان کے والد سخت بیمار ہو گئے تھے۔ فالج کا کیس تھا۔ انہوں نے مجھے بلایا تھا علاج کے لیے..... انہیں اپنے والد سے بہت محبت تھی، ان کا خیال تھا میں انہیں بچا لوں گا۔ مگر میں بچا نہ سکا.....“ تھوڑی دیر چپ رہ کر کہنے لگے ”کبھی کبھی میں سوچتا ہوں مجھے ڈاکٹر نہ بننا چاہیے تھا!“

اس کے بعد دیر تک ہم دونوں خاموش رہے۔ میں سوچ رہا تھا ڈاکٹر کی شخصیت کتنی عجیب اور دلچسپ ہے۔ رات زیادہ ہو گئی تو ہم سرنے کی تیاری کرنے لگے۔ میں اوپر برآمدہ پر

بستر بچھا کر لیٹ گیا۔ سفر میں میں بہت کم سوتا ہوں۔ بڑی کوشش کے بعد نیند آئی مگر جلد ہی آنکھ کھل گئی۔ ہاتھ پر لگی ہوئی گھڑی میں وقت دیکھا تو ڈھائی بجے تھے۔ صبح ہونے میں بہت دیر تھی۔ کر دٹ بدل کر پھر سونا چاہا۔ برابر میں ڈاکٹر کی برقعہ پر نظر پڑی۔ بستر بچھا تھا۔ مگر ڈاکٹر کا ہتہ نہ تھا۔ جھک کر نیچے دیکھا تو ڈاکٹر کھڑکی کھولے تاریک آسمان میں ریختے ہوئے تاروں کو گھور رہے تھے۔

”کیا نیند نہیں آئی ڈاکٹر؟“ میں نے وہیں سے پوچھا۔

”نہیں“ مختصر سا جواب تھا۔

”کوشش تو کی ہوتی؟“ میں نے کہا۔

”کوشش بیکار ہے۔۔۔۔۔ ہاتھ میں درد پڑھ گیا ہے۔“

”ہاتھ میں درد!۔۔۔۔۔ یہ کب سے ہو رہا ہے؟“

”ابھی ہوا ہے“ اوردہ کھڑکی سے ہٹ کر میری طرف مڑ گئے ”یہ درد بچپن سے

ہے۔۔۔۔۔ ہمیشہ نہیں ہوتا۔ کبھی کبھی رات کو یکایک شروع ہو جاتا ہے۔“ اور پھر دہی پھینکی سی مسکراہٹ ان کے ہونٹوں پر پھیل گئی۔

”آپ تو ڈاکٹر ہیں۔ علاج نہیں کیا اس کا؟“ میں نے حیرت سے پوچھا۔

”کیا تھا۔ کئی بار۔ خود بھی کیا اور دوسرے ماہرین سے بھی کرایا۔۔۔۔۔

مگر سب بیکار۔“

”کہاں ہوتا ہے یہ درد؟“ میری حیرت بڑھتی جا رہی تھی۔

”یہاں کہنی کے جوڑ میں“ دایاں ہاتھ اوپر اٹھاتے ہوئے انہوں نے بتایا۔

”در اصل یہ ایک چوڑے کا نتیجہ ہے جو بچپن میں آئی تھی۔۔۔۔۔ میں اس وقت کھڑکی

کے پاس بیٹھا اس چوڑے کے واقعہ کو یاد کر رہا تھا۔ نیند نہ آرہی ہو تو نیچے آجلیئے۔۔۔۔۔

بھی جا رہا ہے اپنی بے وقوفی کی داستان آپ کو بھی سنا دوں۔۔۔۔۔!“

میں نیچے اتر آیا تو انہوں نے کہنا شروع کیا ”میں ان دنوں اسکول میں پڑھتی ہوں

میں پڑھتا تھا۔ جماعت میں ہمیشہ اول آتا تھا اس لیے سارے ساتھی مجھ سے جلتے تھے۔

میں ان کی شرارتوں میں شریک نہ ہوتا تھا۔ کسی کو دکھ پہنچا دیا یا ستانا مجھ سے کبھی برداشت نہ ہوا۔ . . . . ایک دن بہت زور کا طوفان آیا، خوب بارش ہوئی۔ ہمارے اسکول کے سامنے شکر کے کنارے ایک بڑا نیم کا درخت تھا۔ ایک ننھا سا چڑیا کا بچہ اس پر سے نیچے گر کر بُری طرح جیج رہا تھا۔ بہت سے بچے اس کو گھیرے کھڑے تھے۔ ستا ستا کر خوش ہو رہے تھے۔ مجھ سے نہ دیکھا گیا۔ بچہ کو لیکر درخت پر چڑھ گیا کہ واپس گھونسلے میں رکھ دوں گا۔ مگر گھونسلہ بہت اوپر تھا۔ میں ڈر گیا کہیں گر نہ پڑوں۔ نیچے میرے ساتھی مجھ پر ہنس رہے تھے، میرا مذاق اڑا رہے تھے، اوپر گھونسلے میں بچے کے ماباپ مجھے جیج جیج کر بلا رہے تھے۔ بڑے تال کے بعد میں نے گھونسلے تک جانے کا فیصلہ کر لیا! مگر کچھ ہی دور گیا تھا کہ پیر پھسل گیا۔ . . . . اس کے بعد جب ہوش آیا تو میں اپنے گھر میں بستر پر پڑا تھا۔ اور اس کہنی پر پٹی پڑھی ہوئی تھی۔ پوچھنے پر بتہ چلا کہ چڑیا کا بچہ میرے ساتھ گر کر مر گیا تھا۔ . . . مجھے یاد ہے اس کی موت کے غم میں اپنا درد بھی بھول گیا تھا۔ . . . .“

ریل کسی پل پر سے گذر رہی تھی اور اس کے پہیوں کی گر گر گڑا ہٹ اور زیادہ خونخاک ہو گئی تھی۔ کچھ دیر چپ رہ کر اپنے ہاتھ کو آہستہ آہستہ سہلاتے ہوئے ڈاکٹر نے کہنا شروع کیا۔ ”ہڈی جڑ گئی مگر اب بھی کبھی کبھی ایک درد شروع ہو جاتا ہے۔ . . . . جانے کہاں سے اٹھ کر وہ سارا واقعہ پھر ذہن میں گھومنے لگتا ہے۔ میں دیکھتا ہوں جیسے میں اس درخت کے نیچے بے ہوش پڑا ہوں۔ اور۔ . . . . اور میرے پاس ہی اس ننھے سے چڑیا کے بچے کی لاش پڑی ہے۔ . . . .“ ڈاکٹر کے چہرے پر ایک طویل مسکراہٹ پھیل گئی ”کیسی بچوں کی سی بات ہے۔ ہے نا؟“

”ہے تو سہی۔ . . . . مگر آپ نے ڈاکٹر بن کر واقعی غلطی کی۔“ مجھے ہنسی نہ آسکی۔ ڈاکٹر احسان سے یہ میری دوسری ملاقات تھی۔ اور اس ملاقات کے بعد مجھے یوں لگا جیسے شہر کا مشہور ڈاکٹر اندر سے محض ایک بچہ ہے۔ . . . . ایک معصوم، حساس اور جذباتی بچہ!

اس کے بعد ہماری ملاقاتیں زیادہ ہوتی گئیں۔ دوستی بے تکلفی کی حد تک بڑھ گئی۔ رثام کو دقت ہم اکثر ساتھ ہی گزارتے۔ وہ میرے پاس چلے آتے یا میں اُن کے یہاں پہنچ جاتا۔ ایک چھوٹے سے خوبصورت بنگلے میں وہ تنہا اپنی ماں کے ساتھ رہتے تھے۔ دوا خانے کے دقت کے بعد خاص صورتوں میں مرلیضوں کو گھر پر بھی دیکھ لیا کرتے تھے۔ جب کبھی فرصت ہوتی ہم کلب یا سینیا چلے جاتے۔ کبھی کبھی ڈانس پارٹیوں میں ساتھ ہی جاتے۔ . . . . . اسی زمانے میں مجھے پتہ چلا کہ ڈاکٹر احسان اپنے مرلیضوں کا علاج واقعی بڑی محنت سے کرتے ہیں۔ نوابوں اور جاگیرداروں سے بھاری بھاری تمغیں وصول کرنے میں دریغ نہیں کرتے مگر ساتھ ہی غریبوں کا علاج اکثر مفت کر دیا کرتے ہیں۔ بلکہ بعض اوقات قیمتی دوائیں اپنے پاس سے ان کو دیتے۔ . . . . . یہ سبھی کچھ تھا مگر اس دقت بڑی مشکل آ پڑتی جب ان کا کوئی مریض مر جاتا ! وہ بے حد اُداس اور فکر مند ہو جاتے جیسے واقعی ان ہی کی بھول سے اس کی جان گئی ہو ! یہ احساس ان پر کئی کئی دن تک بھاری رہتا۔ ایسے ہی ایک موقع پر میں نے ان سے پوچھا تھا۔

”ڈاکٹر۔ تم شادی کیوں نہیں کر لیتے؟..... کیا زندگی میں کسی رومان کا انتظار ہے؟“ اور ڈاکٹر نے جواب دیا تھا ”بغیر رومان کے شادی کا میں قائل نہیں ہوں..... یوں چھوٹے موٹے رومان تو کئی ہو چکے ہیں..... مگر زندگی کے اصل پارٹنر کا ابھی تک انتظار ہے۔“ اور اس کے بعد وہ بڑی دیر تک نہ جانے کون سے تصورات میں کھوئے رہے! ایک دن شام کے وقت میں ڈاکٹر احسان کے یہاں بیٹھا تھا۔ ہم کہیں باہر جانے کا پروگرام سوچ رہے تھے کہ زکرنے آکر اطلاع دی کوئی غریب بڑھیا ڈاکٹر سے ملنا چاہتی ہے۔ تھوڑے سے پس و پیش کے بعد آسے بلایا گیا۔ بڑھیا کے ساتھ کوئی بیس یا بائیس برس کی ایک لڑکی بھی تھی۔ سانولے سے رنگ کی، بہت ہی معمولی ناک نقشے کی..... سوکھے سوکھے ہاتھ پیرجن کی رگیں ابھری ہوئی، گرد میں آٹے ہوئے سوکھے بال چہرے سے کرب کے آثار نمایاں، بڑھیا نے گڑگڑا کر کہا۔

”یہ میری بیٹی ہے۔ میرے بڑھاپے اور دکھوں کا سہارا! اسے سر کے درد کے

سخت دورے پڑتے ہیں۔ بے ہوش ہو جاتی ہے! ڈاکٹر صاحب اس کو اس مصیبت سے نجات دلائیے..... میں مرتے دم تک آپ کے لیے دعائیں مانگتی رہوں گی۔ اس کے سرا اور کیا کر سکتی ہوں! آپ کی اتنی تعریف سن کر اسے لائی ہوں..... خدا کے لیے اُسے اچھا کر دیجئے۔۔۔۔۔ اور اس کا گلا بھرا گیا۔ آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو گرنے لگے۔ اسے رونے سے منع کر کے ڈاکٹر نے لڑکی کو دیکھا۔

”اس کی شادی ہو چکی ہے؟“ ڈاکٹر نے پوچھا۔

”نہیں ڈاکٹر صاحب۔ سنگتی ہوئی تھی..... مگر اب لڑکا کہتا ہے جب تک اچھی نہ ہو جائے شادی نہیں کروں گا۔ بڑھیلے ناک صاف کرتے ہوئے کہا۔  
”اچھی بات ہے۔ کل صبح کلینک لے آنا۔ علاج شروع کروں گا۔“ احسان نے کہا۔ اور ہم لوگ باہر چلے گئے۔ بات آئی گئی ہو گئی۔

اس کے کوئی ایک مہینے بعد ڈاکٹر احسان ایک دن میرے پاس بیٹھ ہوئے تھے بڑے پریشان، معصوم سے.....! میں نے وجہ پوچھی تو کہنے لگے۔  
”اس بڑھیا کی لڑکی والا کیس یاد ہے؟..... جس کو دردِ سر کے دورے پڑا کرتے تھے!“

”ہاں یاد ہے.....“ میں نے کہا کیا ہوا اُسے؟

”اس کی بیماری کا ٹھیک ٹھیک علاج ابھی تک دنیا میں کسی کو نہیں معلوم!..... تاہم میں کوشش کر رہا ہوں۔ مختلف تدبیریں کیں، نئے نئے تجربے کئے..... اس کے سر کا درد تو جاتا رہا مگر ایک نئی چیز پیدا ہو گئی..... اس کی بصارت کم ہوتی جا رہی ہے!“  
”یہ کیسے ممکن ہے!“ میں نے حیرت سے پوچھا۔ ”یہی تو میں بھی معلوم کرنا چاہتا ہوں۔ بڑا پیچیدہ کیس بن گیا ہے۔ میں نے بعض نئی دوائیں بھی استعمال کی تھیں، شاید ان ہی کے اثر سے دماغ کی بعض رگیں بے کار ہو گئی ہیں..... کچھ سمجھ میں نہیں آتا کیا کیا جائے!“  
ڈاکٹر کے چہرے پر سخت کرب کے آثار پھیلنے جا رہے تھے۔  
”دوسرے ڈاکٹروں سے مشورہ لیا؟“ میں نے پوچھا۔



”کسی کی سمجھ میں نہ آسکا کیا وجہ ہے!“ اور اس کے بعد ہم دونوں خاموش ہو گئے۔ جلد تے دقت انہوں نے بتایا کہ بڑھیا اور اس کی لڑکی کو انہوں نے اپنے ہی گھر کے ایک علمدہ کمرے میں ٹھہرنے کو کہہ دیا ہے جہاں کہ وہ زیادہ باقاعدگی اور احتیاط سے علاج کر سکیں گے۔ اس کے کوئی مہفتہ بھر بعد میں دفتر میں بیٹھا کام کر رہا تھا کہ ڈاکٹر کا فون آیا ”فورا چلے آؤ۔ مجھے تمہاری ضرورت ہے۔“

جب میں ان کے گھر پہنچا تو وہ کمرے میں بے چینی سے ادھر ادھر ٹہل رہے تھے۔ مجھے ایک کرسی پر بیٹھ جانے کو کہا مگر خود ٹہلتے رہے۔ تھوڑی دیر بعد ایک اور کرسی گھسیٹ کر میرے سامنے آ بیٹھے۔

”میں پاگل ہو جاؤں گا..... مجھ سے یہ برداشت نہیں کیا جاتا!..... بتاؤ..... بتاؤ میں کیا کروں؟“ ڈاکٹر کی حالت قابلِ رحم تھی۔ معلوم ہوتا تھا جیسے کسی بھی لمحے وہ بچوں کی طرح پھوٹ پھوٹ کر رونا شروع کر دیں گے۔

”کیا ہوا..... کچھ بتاؤ تو سہی؟“ میں نے پوچھا۔

”یہ میری آخری کوشش تھی۔ آج تین دن بعد اس کی آنکھوں کی پٹیاں کھولی گئیں۔ مگر..... مگر جانتے ہو کیا ہوا؟ وہ..... وہ اب اندھی ہے۔ بالکل اندھی! اب وہ کبھی دیکھ نہ سکے گی..... میں نے اُسے اندھا کر دیا۔ میں نے.....!“

”مگر اس میں تمہارا کیا تصور ڈاکٹر!..... تم نے تو اسے اچھا کرنے کی پوری کوشش کی تھی“ میں نے کہا۔

”پھر وہی بات!“ وہ جھلا اٹھے۔ ”مجھے تسلی دینے کی ضرورت نہیں..... میں نے کہا تھا نایہ میری سب سے بڑی کمزوری ہے۔“ اور وہ پھر اٹھ کر ٹہلنے لگے۔ ”جانتے ہو جاتے دقت اس کی ماں لے کیا کہا؟..... کہنے لگی اس سے تو اچھا ہوتا میری بیٹی مرجاتی..... موت آجاتی اسے۔ اب کہاں در بدر ٹھوکریں کھاتی پھرے گی!..... کون پوچھے گا اس اندھی کو؟“ اور وہ میرے سامنے آکر کھڑے ہو گئے۔ ”تم نے اس کی لڑکی کی وہ بے نور آنکھیں نہیں دیکھیں..... ارہ! معلوم ہوتا ہے جیسے اب

وہ ساری زندگی میرا تعاقب کرتی رہیں گی۔۔۔۔۔

”تم بہت جذباتی ہو گئے ہو ڈاکٹر۔۔۔۔۔ ذرا سنجیدگی سے سوچو۔۔۔۔۔“ میں نے سمجھانا چاہا مگر وہ درمیان ہی میں بول پڑے۔

”میں نے تمہیں لکچر دینے نہیں بلایا ہے۔۔۔۔۔ مجھے کوئی راستہ سمجھاؤ۔ میری مدد کرو۔۔۔۔۔ نہیں تو۔۔۔۔۔ نہیں تو۔۔۔۔۔ اوہ۔۔۔۔۔ نہ معلوم میں کیا کر لوں گا؟“

”کسی پر رحم کھانے کا مطلب یہ نہیں ہوتا ڈاکٹر کہ اپنی یہ حالت بنا لو“ میں نے کہا۔

”رحم؟ — ہاں۔ مجھے اس پر بے حد رحم آ رہا ہے۔ مگر اس سے زیادہ میں

اپنے لیے پریشان ہوں۔ میں اس کے لیے نہیں، اپنے لیے سوچ رہا ہوں۔ مجھے کیسے سکون آئے گا! کیسے معاف کر سکوں گا اپنے آپ کو؟۔۔۔۔۔ کیا تمہیں مجھ پر رحم نہیں آتا؟“

جواب دینے کی بجائے میں ڈاکٹر کو اپنے گھر لے آیا۔ مختلف طریقوں سے ان کو مصروف رکھنے کی کوشش کرتا رہا۔ ہم نے ساتھ کھانا کھایا۔ پھر باہر گھومنے نکل گئے۔ شام کو بھی دیر تک میں ان کے ساتھ رہا۔ اور رات کو دیر گئے جب میں انہیں گھر پر واپس چھوڑنے گیا تو مجھے محسوس ہوا جیسے ان کے ذہن میں مچا ہوا وہ طوفان آہستہ آہستہ تحلیل ہو چکا ہے۔

”کل صبح جب سوکر اٹھو گے تو تمہیں اپنی بے وقوفیوں پر ہنسی آئے گی“ جلتے جلتے میں نے ہنستے ہوئے کہا اور واپس چلا آیا۔

دوسرے دن شام کو جب دفتر سے گھر پہنچا تو نوکر نے ایک بند لفاظہ لا کر دیا جو ڈاکٹر کا نوکر تھوڑی دیر پہلے دے گیا تھا۔ میں نے جلدی سے کھول کر پڑھا شروع کیا:

”تمہاری ساری کوششوں کے باوجود میں کل رات بھر نہ

سو سکا۔ ساری رات سو جتا رہا۔۔۔۔۔ اور آج صبح میں نے

اپنی نجات کا راستہ تلاش کر لیا ہے! میں نے اس لڑکی سے

شادی کرنے کا فیصلہ کر لیا ہے۔۔۔۔۔۔۔ ہاں شادی اتہیں

جب یہ خط ملے گا“ ہماری شادی ہو چکی ہوگی۔ اور ہم کسی

لمبے سفر پر ”ہنی مون“ منانے روانہ ہو چکے ہوں گے..... تمہیں  
 تعجب تو ضرور ہوگا مگر میرے لیے اس کے سوا اور کوئی راستہ  
 نہ تھا۔ شاید یہی وہ لڑکی ہو جس کا میری زندگی کو مدت سے  
 انتظار تھا! میں اسے اپنی آنکھوں سے دیکھنا سیکھا دوں گا۔  
 اور کون جانے شاید اسی بہانے زندگی میں چپکے چپکے رومان  
 آداخل ہو! \_\_\_\_\_ ماں کو سب معلوم ہو چکا ہے۔  
 واپس آنے تک ان کی خبر رکھنا۔ افسوس کہ شادی میں تم شریک  
 نہ ہو سکے۔ تم نے میری ہمدردی میں جو کچھ کیلئے اسے میں کبھی  
 بھول نہ سکوں گا۔ کچھ عرصے کے لیے نہدا حافظ۔

تمہارا

احسان

## شام سے پہلے

ڈاکخانے کے موٹر پر اخبار دالے کی دکان سے ایک انگریزی اخبار خرید کر میں دہیں کھڑے کھڑے پڑھ رہا تھا۔ دراصل اخبار پڑھنے کا میں صرف یہاں نہ کر رہا تھا، ورنہ میری آنکھیں تو سامنے پلیس سینما کے بس اسٹینڈ پر جمی تھیں۔ جہاں کئی لڑکیاں کھڑی آپس میں کسی بات پر زور زور سے ہنس رہی تھیں۔ ان کی ساڑیوں کے مختلف رنگوں نے اس سلونی شام میں رنگینی پھڑک دی تھی، اور پھر ان کے لطیف، چوڑیوں کی چھٹنگ جیسے تھقبے! میں ان کی طرف دیکھنے پر مجبور ہو گیا تھا۔ دو تین کے سوا باقی سب معمولی شکل و صورت کی تھیں۔ کوئی اور دن ہوتا تو میں شاید ان کے دیکھنے پر اتنا وقت صرف نہ کر دیتا۔ لیکن اودھ کوئی دن سے سرلا کی طبیعت خراب تھی۔ گھر سے نکل ہی نہ سکتی تھی۔ شیلو اور ملی بمبئی چلی گئی تھیں، اور رینی کی شادی ہو گئی تھی۔ میری شاہین بالکل اداس اور دیران گذر رہی تھیں۔ آج بڑی مشکل سے تھیلما سے شام کے پکچر کا وعدہ ہوا تھا۔ لیکن ابھی صرف پانچ بجے ہی تھے اور وہ ساڑھے پانچ بجے مجھے غابروڈ پر ملنے والی تھی۔

”کاجو..... بابو جی..... نمکیں کاجو.....“ کاجو بیچنے والا ہتھکان کے قریب سے چلایا۔

”نہیں“ میں نے چونک کر جواب دیا۔

”صرف ایک روپے میں پکیٹ“ وہ اور آگے بڑھا۔ اس کے غلیظ میٹے ہاتھوں میں کاجو کا ڈبہ دیکھ کر گھٹن آنے لگی۔

”مجھے نہیں چاہیے۔“ میں نے کہا

”بڑے عمدہ ہیں بالو جی ..... صرف ایک روپے میں ..... لے لیجئے۔“  
 وہ اس طرح کہنے لگا جیسے کا جو نہیں بیچ رہا بلکہ بھیک مانگ رہا ہو۔ میں چپ رہا۔  
 ”لے لیجئے۔ آج صبح سے ایک بھی نہیں بکا ..... ماں گھر پر بیمار پڑی ہے اور  
 اس نے اور میں نے صبح سے کچھ نہیں کھایا ہے اور بالو جی ..... میرا باپ .....“  
 اور اس کی آنکھیں ڈبڈبائیں۔ گلا بھرا گیا ..... میرا دل رحم کے بے پایاں سمندر  
 میں ڈوبتا چلا گیا۔ اس کی طرف دیکھے بغیر جیب سے ایک روپیہ نکال کر اس کی ہتیلی پر  
 رکھ دیا۔

اخبار موٹر کرئیل میں دباتے ہوئے میں یونہی دقت کاٹنے دیکھا جی رسٹورنٹ کی طرف  
 جانے لگا۔ شام کی چہل پہل کا کافی بڑھ چکی تھی۔ بڑی مشکل سے سڑک عبور کر کے میں دوسری جانب  
 جانے لگا۔ سڑک عبور کرتے ہوئے ایک دو منزلہ بس سے کسی نے جلتا ہوا سگریٹ میرے گال پر  
 پھینک مارا۔ معلوم نہیں اتفاقاً یا قصداً۔ لیکن میں درد سے تڑپ اٹھا۔ پھینکنے والے کو  
 ایک موٹی سی گالی دے کر میں نے گال رگڑ دالا۔ سڑک پار کر کے میں ایک جگہ ٹہر گیا  
 اور سگریٹ سلگانے لگا۔ تھیلما پر بے حد غصہ آ رہا تھا۔ کتنا کہا تھا کم نجات سے کہ پانچ  
 بجے ہی آجائے۔ مگر وہ نہ مانی۔

”ایک پیسہ ..... اللہ نام کا ..... ایک پیسہ“ پیچھے سے ایک بھکاری پیچ  
 پڑا۔ میں نے مڑ کر نظر ڈالی تو وہ پھر آگے آگیا۔ بیمار کمزور سا ٹھنڈا ستر برس کا بوڑھا تھا۔ آنکھوں  
 میں بھوک، فاقے اور بے کسی جھلک رہی تھی۔

”ایک پیسہ ..... صاحب ..... بس ایک پیسہ۔“  
 جب وہ آگے بڑھ گیا تو میں سوچنے لگا۔ یہ فقیر اس دقت بھی ایک  
 پیسہ مانگتے تھے جب ایک پیسہ واقعی ایک پیسہ تھا اور آج بھی وہ ایک ہی پیسہ مانگتے ہیں  
 جب کہ ایک پیسہ اپنی ساری قیمت کھو کر غائب ہو چکا ہے !  
 ”آداب عرض ہے۔“ میں چونک پڑا کوئی صاحب بڑے ادب اور خلوص سے میری  
 طرف بڑھ رہے تھے۔

آدابِ فرض ہے۔“ میں نے کہا اور ہمارے ہاتھ ایک طویل مصلحتی میں مصروف ہو گئے۔ آخر انہوں نے میرے پریشان چہرے کو دیکھ کر ہاتھ چھوڑتے ہوئے کہا۔  
 ”معاف کیجئے..... آپ نے مجھے پہچانا نہیں شاید!“

”جی..... واقعی بات کچھ ایسی ہی ہے.....“ مجھے سخت ندامت محسوس ہو رہی تھی۔ وہ زیر لب مسکرانے لگے۔

”کوئی بات نہیں..... دراصل میں کسی زمرے میں آپ کا نام ملے تھا، جب آپ وہاں..... اعظم پورہ میں رہتے تھے..... میرا مکان آپ کے مکان سے دس بیس قدم پر ہی تھا..... اور میرے والد.....“

”ارے آپ ہیں!..... سچ میں تو بھول ہی گیا تھا۔“ میں نے اخلاقیات کا کہہ تو دیا لیکن دراصل سمجھ میں اب بھی کچھ نہیں آیا تھا کہ ان صاحب کو پہلے کہیں دیکھا بھی ہے یا نہیں۔

”آپ مصروف تو نہیں ہیں؟.... دو چار منٹ تو دے ہی سکیں گے۔“ انہوں نے ایسی بے تکلفی سے کہا کہ اگر دو چار گھنٹے بھی مانگتے تو شاید دینے ہی پڑتے۔  
 ”جی بڑے شوق سے۔“

”بات یہ ہے کہ..... یعنی آپ ذرا ادھر تشریف لے آئیں تو آپ سے کچھ کہوں....  
 .... گھبرائیے نہیں..... کوئی خاص بات نہیں..... لیکن یہاں بھیڑ بہت ہے۔“ اور وہ میرا ہاتھ پکڑ کر برابر ہی بانٹا کی دکان کے سامنے والے موڑ پر لے گئے۔

”آپ وہ رکشہ دیکھ رہے ہیں۔“ اور قریب ہی کھڑے ہوئے ایک سائیکل رکشہ کی طرف اشارہ کر دیا۔ رکشہ پر پردہ پڑا ہوا تھا۔ اس لئے سوائے رکشہ کے بیرون کے میں کچھ اور نہیں دیکھ سکا۔

”جی..... دیکھ رہا ہوں۔“ میں نے جواب دیا۔

”کہنا یہ ہے کہ اس میں..... ایک خاتون ہیں۔“

”جی؟.....“ میں کچھ گھبرانے لگا تھا۔ معلوم نہیں کیوں اتنی لڑکیوں سے ملاقات کر چکنے کے بعد بھی ایسے موقعوں پر میں گھبرا جاتا ہوں۔

”ان کی ابھی شادی نہیں ہوئی..... وہ کافی خوبصورت بھی ہیں..... میری دُور کی عزیز ہیں..... اس لئے اس مصیبت کے وقت ان کی مدد کرنا میرا فرض ہے۔“

”مصیبت؟“

”جی..... گذشتہ مہنگاموں میں ان کا سب کچھ لوٹ گیا۔ ان کے والد کہیں گرداور تھے، بے چارے قتل کر دئے گئے۔ سب سامان لوٹ لیا گیا۔ بھائی کی نوکری چلی گئی..... منسلی سے تنگ آچکی ہیں..... کیسی نازوں میں پی تھیں..... اور آج..... باہ!“

شادہ صاحب رونے لگے تھے۔ تھوڑی دیر چپ رہ کر کہنے لگے۔

”مگر آپ یہاں کب تک کھڑے رہیں گے۔ وہیں تشریف لے جائیے نا!..... آپ سے جیسی ہو مدد فرمادیجئے..... اور سینما تو آپ جلتے ہی ہوں گے۔ یا پھر کوئی ہوٹل رستوراں..... اور یقیناً منسے آپ ان سے مل کر بہت خوش ہوں گے۔“

”لیکن جناب..... بات یہ ہے..... یعنی مجھے اس وقت ایک دوست کا سخت انتظار ہے..... ورنہ..... ورنہ میں۔“

”اس میں کیا مضائقہ ہے! آپ کے دوست بھی ساتھ ہوں گے تو کیا ہرج ہے۔“

میرا مطلب ہے.....“

”جی نہیں..... اہل میں وہ میرے دوست بھی ہیں اور بھائی بھی..... آپ مجھے تو معاف ہی کیجئے۔“ کہتے ہوئے میں نے دس روپے کا ایک نوٹ ان کی ہتیلی میں تھما دیا۔ وہ کچھ کہنا ہی چاہتے تھے کہ میں وہاں سے کھسک آیا۔ مجھے اب ان صاحب پر بے حد غصہ آ رہا تھا۔ کس طریقے سے اپنے آپ کو چھپانا چاہتے ہیں یہ لوگ!..... اور مجھے خود اپنے اوپر بھی غصہ آ رہا تھا۔ بھلا ان صاحب کو وہ نوٹ کیوں دے دیا؟ اس قدر گھبرا کر کیا تھامیں؟..... اور پھر ان کی اس عزیزہ پر بھی غصہ آ رہا تھا..... مجھے سب پر غصہ آ رہا تھا..... اور سب سے زیادہ قہیلا پر۔

”ارے..... رسک تم کہاں؟“ اور کسی نے پوری قوت سے میری پیٹھ پر ایک دو ہتھڑا جمادیا۔ میں اپنے خیالات سے چونک پڑا پلٹ کر دیکھا تو بچپن کا دوست حلیم تھا.....

اور پھر وہیں سڑک پر بھڑکے درمیان کئی راہ چلتوں کو ادھر ادھر رک جانے پر مجبور کرتے ہوئے ہم دونوں بغل گیر ہو گئے اور جب اُلجھدہ ہوئے تو ایک انگرز میم صاحبہ کچھ بڑبڑاتی ہوئی پاس سے گزر گئیں۔

”کہو یار..... کس حال میں ہو..... کتنے دن بعد ملے ہو؟“ حلیم نے کہا۔  
 ”ٹھیک ہوں..... اور تم؟ تم اتنے دن کہاں رہے؟ کیا کر رہے ہو؟“  
 میں ایک ہی سانس میں سب کچھ پوچھتا چلا گیا۔

”میں مدراس چلا گیا تھا۔ وہاں کچھ کاروبار شروع کیا تھا۔ مگر اب یہاں بینک میں نوکری ہو گئی ہوں..... اور یہاں کب تک کھڑے رہیں گے..... آؤ اس ہوٹل میں بیچہ کر باتیں کریں گے..... مصروف تو نہیں ہونا؟“

”نہیں..... نہیں کوئی ایسی مصروفیت نہیں ہے.....“ ہم سامنے والے ایک ہوٹل میں داخل ہو گئے۔ ہاتھ پر لگی ہوئی گھڑی میں دقت دیکھا۔ سوایا پنج بج چکے تھے۔ پندرہ منٹ بعد مجھے عقلمنا سے ملنے بس اسٹینڈ پر جانا تھا۔ میں سوچنے لگا اس حلیم سے کیسے چھٹکارہ ہو گا اتنے دن بعد تو ملتا تھا وہ!

یاد ہے..... ہم اسکول سے بھاگ بھاگ کر اسی ہوٹل میں چائے پینے آیا کرتے تھے۔ ایک خالی میز پر بیٹھتے ہوئے حلیم بولا۔ ہم دونوں ہنس پڑے۔ بچپن کی سی مصموم ہنسی۔  
 ”رسک..... تم نے شادی کر لی یا نہیں؟“ وہ ایک دم میز پر جھک کر پوچھنے لگا۔  
 ”نہیں..... ابھی تک تو نہیں کی“

”اور وہ تمہاری للی کیا ہوئی..... کیا ابھی تک.....؟“ اور دانت نکالے وہ بُری طرح ہنسنے لگا۔ مجھے ذرا سی دیر کے لیے اس پر غصہ آ گیا۔ للی بہت دن ہوئے میری دوستی چھوڑ چھاڑ، بیکسی چلی گئی تھی اور سنا تھا وہاں کسی اینگلو انڈین لڑکے پر بری طرح فدا ہو رہی تھی۔ میں حلیم کو بتانے لگا۔

”للی کی شادی زبردستی اس کے چچا زاد بھائی سے کر دی گئی۔“  
 ”ارے پچ پچ..... بے چاری..... مگر وہ مان کیسے گئی؟“



”یہاں ہی اسے سمجھایا تھا..... والدین کی مخالفت ٹھیک نہیں ہوتی۔“ اور میں سنجیدگی اور بزرگی کے سارے آثار چہرے پر جمع کرنے کی کوشش کرنے لگا۔ ہم ذرا سی دیر چپ رہے۔ ویٹر کو دو کولڈ ڈرنک لانے کے لیے کہہ دیا۔

”اور تم حلیم؟..... تم بھی ابھی اکیلے ہی ہو؟“ جیب سے سگریٹ اور دیا سلانی کی ڈبیہ نکال کر میز پر رکھتے ہوئے میں پوچھا اور جواب میں حلیم نے ایک لمبا سانس فضا میں چھوڑ دیا۔

”ابھی تک تو اکیلا ہوں۔“ اس نے کہا۔ اس کے ہونٹوں پر بہت ہلکی سی مسکراہٹ پھیلتی چلی گئی۔

”تو ابھی کوڑھ میں مسکرا رہا ہے۔“ میں مسکرانے لگا۔ لیکن جواب میں وہ کچھ نہیں بولا۔ اس کی آنکھیں بتا رہی تھیں کہ ان کی گہرائیوں میں ضرور کسی کی محبت کر ڈالے چکی تھی۔ آہستہ سے اس جیب سے ایک خوبصورت سا سگریٹ کیس نکالا۔ اور اسے کھول کر ایک سگریٹ اپنے ہونٹوں میں دبایا۔ مجھے سخت تعجب ہوا کیونکہ میں نے اس سے پہلے اسے کبھی سگریٹ پیتے ہوئے نہیں دیکھا تھا۔

”کیا مطلب؟“

”اس نے مجھے یہ سگریٹ کیس پرینٹ کیا تھا..... اور میں نے اسی دن سے سگریٹ

پینا شروع کر دیا۔“

”او..... تو یہ بات ہے!“ میں مسکرانے لگا۔ ”مگر وہ کون ہے کچھ بتاؤ گے نہیں؟“

”وہ ایک کرسمین لڑکی ہے۔ ایک دن کسی کام سے بینک آئی تھی۔ وہیں سے ہماری دوستی شروع ہو گئی۔“ اور میں سوچنے لگا۔ ایک سگریٹ کیس دے کر اب تک نہ جانے کتنے رہے اُس نے اس نے اس بیوقوف حلیم سے انیٹھ لئے ہوں گے! یہ سب اسی طرح کی ہوتی ہیں اور پھر میں فیملیا کے کے متعلق سوچنے لگا..... ”ایک دن میں ہی وہ مجھ سے اس قدر بے تکلف ہو گئی تھی۔ میری جیب میں بھرے ہوئے نوٹ اسے نظر آچکے تھے۔ مگر شاید حلیم کی فیملیا ایسی نہ ہو۔ شاید وہ حلیم سے سچی محبت کرتی ہو اور اسے معلوم ایک دن ان کی زندگیاں خوشیوں سے بھر جائیں۔ میں نے سڑا کا ایک بڑا سا گھونٹ لیا۔ حلیم اپنے تصورات میں گم تھا۔

”وہ بہت سیدھی سادی معصوم سی لڑکی ہے رسک۔ کسی اسکول میں بچوں کو پڑھاتی ہے اور رسک وہ مجھے بہت پسند کرتی ہے۔ میں اس سے محبت کرنے لگا ہوں..... بے پناہ محبت۔ وہ روز شام کو غصہ سے کہیں نہ کہیں ملتی۔ کسی ریٹوران میں کسی باغ میں، بھیل کے کنارے سینا میں..... اور میں اس کے خوبصورت کٹے ہوئے بالوں میں نگاہ کا پھول لگا دیتا۔ اور وہ میرے ہاتھ پر اپنا گال رکھ دیتی۔ اور وہ لمس میری روح میں سرایت کر جاتا۔ وقت بہتے بہتے رک سا جاتا اور پھر وہ خرابا جاتی..... اس کے کانوں میں پڑے ہوئے خوبصورت آدیزے ہل اٹھتے..... اور رسک اس کے سانولے سلونے گالوں کو دیکھو تو معلوم ہوتا ہے جیسے شام کے اندھیرے میں دن رات سے گلے مل رہا ہو۔ اس کی آنکھوں میں اندھیری راتوں کا کاجل اتر آیا ہے۔ وہ ہنستی ہے تو سینکڑوں چوڑیاں آپس میں ٹکرا جاتی ہیں۔ اور رسک تم اس کو دیکھو گے تو..... لیکن رسک بچھلی مرتبہ اس نے وعدہ کیا تھا آج میرے ساتھ سینا چلے گی۔ اور اب وقت ہو گیا ہے... .... مجھے معاف کرنا رسک..... میں اب جا رہا ہوں۔“ اس نے جیب سے بل کے پیسے نکال کر میز پر رکھ دئے اور تیز قدموں سے باہر نکل گیا۔

میں کچھ لمحے چپ بیٹھا رہا۔ میں سوچ رہا تھا کہ حلیم کو اس سے کتنی محبت ہے۔ کیا وہ بھی اس سے اتنی ہی محبت کرتی ہوگی! کیا وہ جانتی ہے حلیم ہر وقت اس کے تصورات میں کھویا رہتا ہے..... اور پھر میری نظر گھڑی پر جا پڑی۔ ساڑھے پانچ ہو چکے تھے۔ ادھ..... تھیلا میں فوراً ہونٹ سے نکل آیا۔

سڑک پر لوگوں کا ہجوم اور بڑھ گیا تھا۔ شام کا اندھیرا گہرا ہو چلا تھا۔ کہیں کہیں دکانوں پر لال، نیلے اور ہرے رنگ کی روشنیوں میں ناموں اور اشتہاروں کے حروف جگمگانے لگے تھے۔ میں بس اسٹینڈ کی طرف بڑھا جا رہا تھا۔ کہیں وہ اگر واپس نہ چلی جائے۔

بس اسٹینڈ ابھی کچھ دور ہی تھا کہ وہ مجھے نظر آگئی، لیکن اس کے ساتھ حلیم تھا۔ میرے قدم وہیں رک گئے۔ کچھ دیر میری کچھ سمجھ میں نہیں آیا۔ وہ دونوں باتوں میں مصروف تھے۔ حلیم کے چہرے پر اب بھی وہی معصوم محبت کے جذبات چمک رہے تھے۔ البتہ تھیلا کچھ گھبرائی ہوئی نظر آتی تھی۔ وہ ادھر ادھر دیکھ رہی تھی جیسے کسی کی تلاش ہو۔ اور اب میں سب

کچھ جان گیا تھا۔ شاید مجھ سے وعدہ کرتے وقت اسے یاد نہیں رہا تھا کہ وہ حلیم سے بھی اسی دن کا وعدہ کر چکی ہے.....

میں بھیر میں ایک طرف کو چھپ گیا۔ میں وہاں حلیم کے سامنے نہیں جانا چاہتا تھا۔ بے چارہ حلیم۔ اسے یہ نہیں معلوم کہ اس کی فیصلہ آج کی شام میرے ساتھ گزارنے والی تھی..... اور اس کی رات فونی سلونی تھیلما کل کی شام کسی اور کے ساتھ ہوگی۔ اس کی آنکھوں کی رات کا کاہل پرسوں کسی اور کے لئے ہوگا۔ اور..... اور جب کسی دن وہ سب جان جائے گا تو اس کے خوابوں کا تاج محل ٹوٹ پھوٹ کر گر جائے گا۔ شاید پھر کبھی وہ کسی سے محبت نہ کر سکے گا۔ اور جب ایک بس آکر وہاں کھڑے ہوئے تمام مسافروں کو سیٹ لے گئی تو میں بھی اپنی جگہ سے باہر نکل آیا۔ بس اسٹینڈ خالی تھا۔ وہ دونوں بھی جا چکے تھے۔ مجھے ایک قسم کی راحت، ایک اطمینان سا محسوس ہوا، اور ساتھ ہی ایک تلخی، ایک کردوا احساس میرے دل و دماغ پر چھا گیا۔ میں مکاڑوں اور دکانوں کے پرے تاریکی میں گم ہوتے ہوئے آسمان کو دیکھتا آگے بڑھ گیا۔

”کاجو..... نمکیں کاجو صاحب.....“ کوئی میرے کان کے پاس چلا آیا۔  
”صرف ایک روپے میں..... صاحب بس ایک روپے میں“

”نہیں۔“ اور میں آگے بڑھ گیا۔ میرے خیالات، میرا شعور اس دقت کہیں اور تھا۔

”صاحب..... صبح سے ایک پیکٹ بھی نہیں بکا ہے..... اور گھر پر میری ماں بیمار پڑی ہے..... اور صاحب۔ میں نے اور میری ماں نے صبح سے کچھ بھی نہیں کھایا ہے..... اور میرا باپ“ \_\_\_\_\_ اور وہ چپ ہو گیا۔ اس کا گلا بھر آیا..... اس کی آنکھیں آنسوؤں کے بوجھ سے جھمک گئیں۔

اور اب میں رُک کر اسے گھور رہا تھا۔ میرے کچھ کہنے سے پہلے ہی وہ مجھے دیکھ کر چپ چاپ وہاں سے چل دیا۔